جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

۱۹۹۴

مدیر : خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد

نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء، جمادی الاول ۱۴۱۹ عدد ۹

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۷۸۳۳۲۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۳

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

شرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

علمی کام اور اخبار کی ضرورت

ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آتے ہی اولین کام جو کیا گیا وہ علمی شعبے کا قیام تھا۔ سردست اس میں صرف دو آدمی ہیں۔ ایک مولوی صدر الدین اصلاحی' دوسرا ابوالاعلیٰ مودودی۔ اگرچہ بے سروسامانی قابل داد ہے۔ اتنا عظیم الشان کام سامنے ہے اور صرف دو آدمی اس کی ابتدا کر رہے ہیں' اور وہ بھی اس حال میں کہ کتب خانہ گویا موجود ہی نہیں۔ لیکن اگر ہمارا عزم راسخ اور ہماری نیت خالص ہے تو یہی بے سروسامانی جس پر شاید بعض لوگ مضحکہ اڑانے میں بھی تامل نہ کریں گے' ایک روز رحمت الٰہی کی مستحق ثابت ہو گی--- اس شعبے کے لیے ہم کو ایک اعلیٰ درجے کا منتخب کتب خانہ درکار ہے اور نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت مطلوب ہے جو بہترین ذہنی صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ اونچے ارادے اور ان ارادوں میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کی قوت رکھتے ہوں.......

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس موقع پر ہمارے لیے کم از کم ایک ہفتہ وار اخبار کی سخت ضرورت ہے۔ محض ایک ماہوار رسالہ ان مقاصد کے لیے بالکل ناکافی ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ جب تک ہمارا ایک پرچہ تیار ہو کر نکلتا ہے' دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ہمارا اور حریف طاقتوں کا مقابلہ گویا چھکڑے اور موٹر کا مقابلہ ہے۔ روزانہ بیسیوں مسائل پیش آتے ہیں جن پر وقت کے وقت لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے' مگر ہمیں مجبوراً دوسرے مہینے کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور ماہوار رسالے کی اشاعت کا وقت آتے آتے وہ مسائل پرانے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اس رسالے کی حیثیت بھی اس کی متقاضی ہے کہ اس کو صرف اصولی مباحث کے لیے مخصوص رکھا جائے اور اگر فروعی مسائل چھیڑے بھی جائیں تو صرف اس حد تک کہ ان سے اصول کی تشریح ہو سکے۔ اس سے زیادہ تفصیلی و جزئی مسائل کا یہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس کے لیے ایک اخبار ہی کی ضرورت ہے۔ (اشارات' سید ابوالاعلیٰ مودودی' ترجمان القرآن' جلد ۱۳' عدد ۱' رجب ۱۳۵۷ھ' ستمبر ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

معاشی ترقی کا نصب العین؟

خورشید احمد

ہماری، خصوصاً پاکستانی حکمرانوں کی ساری تگ و دو کا منتہاے مقصود بالعموم "معاشی ترقی" رہا ہے۔ موجودہ حکومت بھی اپنی ترجیح اول یہی بتاتی ہے کہ ملک معاشی طور پر زیادہ سے زیادہ اور تیز رفتاری کے ساتھ "ترقی" کرے تاکہ ہمارا شمار بھی دنیا کی ترقی یافتہ، خوش حال اور متمدن اقوام کی صف میں ہونے لگے---- بہ ظاہر اس معصوم سی خواہش میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، مگر---- ایک لمحے کے لیے رک کر ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ، صورت حال پر غور کر لینا چاہیے۔

آج کی دنیا میں یہ دو سوال بنیادی اہمیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کا جواب مسلم دنیا کے مفکرین کے ذمے انسانیت کا قرض ہے:

۱- گذشتہ چالیس پچاس سال سے ترقی کا سفر، خاص طور پر مسلم دنیا میں اور عموماً تیسری دنیا میں، قابل ذکر خوش حالی اور فلاح و بہبود کی منزل تک نہیں پہنچ سکا ہے، تو کیا اس کے حصول کا کوئی دوسرا طریقہ ہے؟

۲- سرمایہ داری اور اشتراکیت نے انسانیت کو جس بند گلی میں لاکھڑا کیا ہے، کیا اس سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟

مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس متبادل راستہ موجود ہے۔ اسلام محض ایک مذہب نہیں جو بندے اور خدا کے درمیان ذاتی تعلق کا ذریعہ ہو، بلکہ یہ انسانیت کے جملہ مسائل، بہ شمول معاشی امور میں رہنمائی مہیا کرتا ہے۔ اس کی پیروی سے نہ صرف دنیا میں خوش حالی کی منزل حاصل ہوتی ہے بلکہ اخروی فلاح بھی یقینی ہوتی ہے۔

اقتصادی طور پر خوشحال اور سیاسی طور پر غالب مغرب ہو' یا ایشیا اور افریقہ کے غربت زدہ' وہ نو آزاد ممالک ہوں' جن پر چند عشروں پہلے تک مغربی ممالک کا نو آبادیاتی تسلط تھا' دوسری جنگ عظیم کے بعد کے عہد میں ہر جگہ جس دیوتا کی پرستش کی گئی' اس کا نام "ترقی" تجویز کیا گیا۔

جرمن سکالر وولف گینگ ساش کہتے ہیں: "گذشتہ چالیس برس کو ترقی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے...... روشنی کا وہ سربفلک مینار جو ملاحوں کو ساحل کا نشان منزل دیتا ہے۔ "ترقی" ہی وہ تصور تھا جس نے ابھرنے والی اقوام کا جنگ کے بعد کا' تاریخی سفر متعین کیا۔ جمہوریت ہو یا آمریت' جنوب کے ممالک نے نو آبادیاتی تسلط سے آزادی کے بعد ترقی کو اپنی امنگوں اور آرزوؤں کا محور ٹھیرایا۔ چار عشروں کے بعد بھی دنیا کی کم و بیش تمام حکومتوں اور عوام کی نظریں اسی "مینارہ نور" پر جمی ہوئی ہیں' حالانکہ وہ اب بھی ان کی پہنچ سے اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے دن تھا۔ ہرچند کہ ترقی کے حصول کے لیے جتنی کوشش کی جائے اور جو قربانی دی جائے' اس کا جواز یقیناً موجود ہے' لیکن نگاہیں جس روشنی پر مرکوز ہیں وہ بتدریج اندھیرے میں گم ہوا چاہتی ہے..... تب سے شمال اور جنوب کے تعلقات اسی پس منظر میں تشکیل پاتے رہے ہیں۔ "ترقی" نے ہی اس حوالے سے وہ بنیادی سانچا مہیا کیا' جو دراصل فیاضی' رشوت اور استعماری غلبے کا مرکب ہے۔ یہی ہدف ترقی یافتہ شمال کی' غیر ترقی یافتہ جنوب کے لیے مرتب کردہ پالیسیوں کی پہچان ہے۔ آدھی صدی ہونے کو آ رہی ہے اور روئے زمیں پر اچھی ہمسائیگی کو اسی ترقی کی روشنی میں دیکھنے سمجھنے کی کوشش ہو رہی ہے"۔

لیکن یہ منظر اب تبدیل ہو رہا ہے۔ وولف گینگ ساش ہی کے بقول: "آج اس روشنی کے مینار میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور یہ دھڑام سے گرنے والا ہے۔ دانشوروں کے نزدیک یہ نام نہاد ترقی ایک ویرانہ ہے"۔ اور حقیقت میں "اس دور کا اختتام قریب ہے اور اس کا مرثیہ لکھنے کا وقت آ گیا ہے"۔

Wolfgang Sachs ed "The Development Dictionary: A Guide to Knowledge as Power,

(لندن' ریڈ بکس لیمٹڈ' ۱۹۹۲' ص ۱)۔ یہی وجہ ہے کہ اب ایسے مرثیے منظر عام پر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ "پہلا عالم گیر انقلاب" انجمن روم کی کونسل کی رپورٹ ہے جو عالمی سطح کے دانش وروں کی طرف سے اسی طرح کا ایک مرثیہ ہے۔ اسی تسلسل میں اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی رپورٹ ۱۹۹۲ ایک اور نوحہ ہے۔ اگرچہ اس کا انداز ذرا مختلف ہے۔ انجمن روم کے دانش ور اس طرح ابتدا کرتے ہیں: "نئی صدی کی دہلیز پر انسانیت غیر یقینی اور مایوسی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ بلکہ گذشتہ ہزار سالہ عہد' عظیم الشان تبدیلیوں کے ساتھ بے یقینی اور تذبذب کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کر رہا ہے"۔

انجمن روم کی رپورٹ میں افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ "اس دوران ترقیاتی اقدامات کے نتائج غیر متوازن اور بیشتر مایوس کن رہے"۔ رپورٹ میں تنبیہ کی گئی ہے: "عالمی غربت کے گمبھیر مسائل'

جن میں آبادی میں اضافہ سرفہرست ہے' ایسے انتشار اور ناہمواری کو جنم دے سکتے ہیں' جس کے عالم گیر نتائج سے صنعتی ممالک بھی اپنے آپ کو بچا نہیں سکیں گے" (ص xv)۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "یہ بات خوش حال ممالک کے اپنے مفاد میں ہے کہ ترقی کے مسائل کا سامنا کرنے کے لیے ایک نیا' اور انقلابی طرز عمل اختیار کیا جائے" (ص ۱۶)۔

اقوام متحدہ کی ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۲ یہ حیران کن حقیقت بھی سامنے لا رہی ہے کہ تین عشرے کی نام نہاد عالمی ترقیاتی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہو گئے ہیں۔ ۱۹۶۰ کی پانچ ارب آبادی میں سے امیر ترین ایک ارب لوگ' غریب ترین ایک ارب لوگوں سے ۳۰ گنا زیادہ مال دار تھے۔ مختلف ملکوں کے درمیان یہ فرق آخری اندازوں کے مطابق امیر ترین ۲۰ فی صد لوگوں کے غریب ترین' ۲۰ فی صد سے تقریباً ۱۵۰ گنا زیادہ مال دار ہونے تک ہے۔ روزنامہ گارجین لندن کے اداریے میں یہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ "ترقی پذیر ممالک' مارکیٹ میں غیر مساوی شریک کار بن کر داخل ہوتے ہیں اور نامساوی حصہ لے کر پلٹتے ہیں" (۲۴ اپریل ۹۲)۔

روزنامہ گارجین کو اپنے اداریے میں یہ کہتے ہوئے تکلف ہے کہ بین الاقوامی ماہرین اقتصادیات اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں' تیسری دنیا اپنے ناکردہ گناہ کی پاداش میں جو تاوان ادا کر رہی ہے' یہ ترقی پذیر ممالک کے ساتھ کھلی فریب کاری ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور مانتا ہے کہ "اس طرز عمل کے نتائج وہی ہیں جو خود فریبی کے ہو سکتے ہیں"۔ اداریے میں اس المناک نتیجے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ "دنیا کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کے لیے ترقی کے جن تین عشروں کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا' حقیقت میں وہ تنزل کے عشرے ثابت ہوئے ہیں" (۲۵ اپریل ۹۲)۔

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو خود امیر اور ترقی یافتہ ممالک کی اندرونی کیفیت بھی چنداں مختلف نہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے متعلق "کانگریشنل بجٹ آفس" نے جو اعداد و شمار جاری کیے تھے' اس کے مطابق آبادی کے ایک فی صد اہم ترین حصے نے ۱۹۷۷ اور ۱۹۸۹ کے درمیان اوسط گھریلو آمدنی میں اضافے کا تقریباً ۷۰ فی صد حاصل کیا۔ اس عرصے کے دوران ۲۰ فی صد امیر ترین لوگوں کی آمدنی میں اضافے کا رجحان ہوش ربا ہے۔ اس حصے نے اوسط آمدنی میں ۱۰۰ فی صد سے بھی زیادہ ہتھیا لیا۔ نتیجتاً ۴۰ فی صد غریب لوگ' امیروں کے حق میں ۱۵ برس پہلے پانے والی آمدنی کے ایک بڑے حصے سے محروم کر دیے گئے (اداریہ دی نیویارک ٹائمز' بحوالہ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون' ۲۳ اپریل ۹۲)۔

عالمی سطح پر یہ وہ تناظر ہے جس میں ہم "ترقی" کے روگ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ہم کسی آئندہ موقع پر وہ لائحہ عمل بھی تجویز کریں گے جس کے مطابق ترقیاتی پالیسی کی اسلامی تشکیل کی جا سکتی ہے۔

انسانی نفسیات کی سب سے بڑی کمزوری عجلت پسندی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے نصب العین، مقاصد، مفادات اور اہداف کے حصول کے لیے ہمیشہ مختصر راستوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو جب سیاسی آزادی ملی تو اپنی اقتصادی اور سماجی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ان کی تڑپ بجا طور پر بڑھ گئی۔ مغرب سے موازنہ کرتے ہوئے ان ممالک کو اپنی انتہا غربت اور امیر و غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق کا احساس بہت زیادہ ستانے لگا۔ نو آبادیاتی تسلط کے دوران تیسری دنیا نے مغربی ترقی کی فتح مندیوں کی کئی داستانیں سنی تھیں۔ آزادی کی نعمت ملی تو ترقی کی نیلم پری کی خاطر انھیں مغرب کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دی گئی۔ ان کے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف اقتصادی ترقی میں دکھایا گیا۔

ترقی کی جستجو میں خوش حالی کا موثر ترین ذریعہ صنعت کاری نظر آئی۔ اس کے لیے تشکیل زر (capital formation) کو کلید بتایا گیا۔ بچت اور ادائیگی میں فرق کو ختم کرنے کا علاج، مغربی ٹکنالوجی کی درآمد اور غیر ملکی امداد کے سہارے کو سمجھا گیا۔ ترقی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے، درآمدات کے متبادل تلاش کرنے اور کسی حد تک برآمدات میں اضافہ کرنے کی پالیسیاں تشکیل دی گئیں۔ اقتصادی ترقی کا مغربی ماڈل، وہ "نیا دیوتا" تھا جس کی قربان گاہ پر باقی سب کچھ لٹایا گیا: اخلاقی اقدار، ثقافتی ورثے، سماجی طور طریقے، قومی رسوم، دین، غرض سبھی کچھ اس کے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ فرض کر لیا گیا کہ قومی آمدنی (GNP) میں اضافہ ہو، تب ہی خوش حالی اور ترقی کا نیا دور شروع ہو گا۔ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے نقش قدم پر چل کر ہی انسانیت، خوش حالی کے نئے دور میں داخل ہو سکے گی۔

صورت حال کی یہ مختصر تصویر اگرچہ بہت تشنہ ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ترقیاتی حکمت عملی کے جو مغربی ماڈل تھے، انھیں جن خوش رنگ نعروں میں پیش کیا گیا تھا، ان میں سادگی اور رواداری کا بھی چرچا تھا۔ خوب صورت اصطلاحات کی بھرمار نے انھیں زرق برق پیرہن میں ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے باطن سے مغربی طرز حیات کی برتری کا متکبرانہ اظہار لازماً ہوتا رہتا تھا۔ مغربی ماڈل کو قبول کرنے کے لیے اس مختصر مراعات یافتہ طبقے کی طرف سے بڑے اشتیاق اور جوش و جذبے کا اظہار ہوا، جس کی تعلیم و تربیت مغرب میں ہوئی، جو نو آبادیاتی پالنے میں پروان چڑھا اور جسے واپس جاتے ہوئے سفید فام آقاؤں نے مقامی اقتدار سونپا تھا۔ لیکن قوت و اقتدار سے سرشار اس دیسی طبقے اور مغرب کا باہمی بندھن، آج سخت دباؤ سے دوچار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس ترقیاتی حکمت عملی کو کامیاب کرنے کے لیے ان دو گروہوں نے شعبدہ بازی سے "ترقی و خوش حالی" کا خواب دکھایا تھا، وہ مطلوبہ نتائج دکھانے میں ناکام رہا ہے۔ قریب قریب ہر ترقی پذیر ملک میں ایسی قابل لحاظ مقامی قوتیں موجود ہیں، جو مغربی ماڈل سے چنداں متاثر نہیں اور مسلسل

ایسی راہوں کی تلاش میں سرگرم عمل ہیں، جو ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے ثقافتی تشخص کی بھی ضامن اور محافظ ہوں۔ مراعات یافتہ مغرب زدہ اقلیت کو ہر جگہ ان مقامی قوتوں کے چیلنج کا سامنا ہے۔

ترقی کے جس بے ربط ڈرامے سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی گئی تھیں، گذشتہ تیس برس کا ریکارڈ اس کے المناک انجام کی خبر دیتا ہے۔ ان اقوام کی قسمت پر غربت، اقتصادی زبوں حالی اور جمود کی کیفیت بدستور طاری ہے۔ صنعتی انقلاب کی دو صدیاں گزرنے کے بعد اور تین عشروں کے ترقیاتی طمطراق اور دھوم دھام کے باوجود یہ افسوس ناک نتیجہ سامنے آیا ہے کہ عالم انسانی کی غالب اکثریت غریب بھی ہے اور مناسب خوراک سے بھی محروم ہے، امراض کا شکار بھی ہے اور بیش تر غیر تعلیم یافتہ بھی، حتیٰ کہ اسے سر چھپانے کی کم سے کم سہولت تک میسر نہیں ہے۔ عالمی بنک خود معذرت خواہانہ لہجہ میں اعتراف کر رہا ہے کہ نشان غربت و افلاس (poverty line) سے اوپر آمدنی کے حصول میں ناکامی ہوئی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک کی اندازاً ۴۰ فی صد آبادی غربت کی آخری حدوں (absolute poverty) کے بھی پیچھے بھٹک رہی ہے۔

بلاشبہ اس ترقیاتی عمل کے نتیجے میں خوش حالی کے چند "جزیرے" ضرور ابھرے ہیں، لیکن معاشرے کی عمومی حالت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، اور نہ زندگی کے مختلف شعبوں کو کوئی مثبت سہارا ملا ہے۔ سرمائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار نے قیمتوں کے ڈھانچے، شرح مبادلہ، ٹیکسوں کے نظام، اجرتوں کے پیمانے اور ٹکنالوجی کی شکلوں کو مسلسل توڑ پھوڑ اور بگاڑ سے دوچار کر رکھا ہے۔ دولت کی منصفانہ تقسیم پر کوئی توجہ نہ دی گئی، چنانچہ اقتصادی اور سماجی ناہمواریاں بڑھ گئی ہیں۔ روزگار کی فراہمی کے ضمن میں نتائج مطلوبہ معیار سے بہت ہی کم رہے۔ آبادی میں جو قدرتی اضافہ ہوتا ہے اس کے نتیجے میں محنت کشوں کی تعداد تو بڑھی ہے، لیکن اسے معیشت میں کھپانے اور روزگار دلانے کا مناسب اہتمام نہیں ہو سکا۔ درآمدات کے متبادل پیدا کرنے پر توجہ کے باوجود درآمدات ہی پر تکیہ بڑھتا جا رہا ہے۔ توازن ادائیگی عموماً ترقی پذیر ممالک کے لیے منفی رہا ہے، جس کی وجہ سے تجارتی خسارہ زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک سے تیسری دنیا کی طرف سرمائے اور وسائل کا بہاؤ نہ صرف خطرناک حد تک کم ہوا ہے بلکہ بعض صورتوں میں الٹا چل پڑا ہے، یعنی لینے کے دینے پڑ رہے ہیں۔ توانائی کے بحران نے وسائل کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

یہاں چند الفاظ میں وہ بین الاقوامی پس منظر واضح کرنا بھی ضروری ہے جس میں تیسری دنیا کی ترقیاتی کوششوں کا اہتمام ہوا۔ نو آبادیاتی دور میں، بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کے لیے مغرب پر انحصار کا جو انداز اختیار کیا گیا تھا، اس کی قوت اور گرفت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ غریب اور امیر اقوام میں فرق بڑھ رہا ہے۔

بین الاقوامی اشیاے تجارت کی قیمتوں میں جو بے ہنگم اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے' اس کا بیشتر نقصان ترقی پذیر ممالک کو پہنچتا ہے۔ ان ممالک میں جو مالیاتی اور تجارتی پالیسیاں تشکیل پاتی ہیں وہ افراط زر کی حالت کو بگاڑتی رہتی ہیں۔

چوبیس ترقی یافتہ ممالک میں سے بیس ایسے ہیں جنھوں نے ترقی یافتہ ممالک سے درآمدات کے خلاف حفاظتی حصار قائم کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کو توازن ادائیگی کے سخت ترین مسائل کا سامنا ہے اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے معاملے کو سلجھانے سے قاصر ہیں۔ ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۲ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کو دنیا کے غریب ممالک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فعال بنانا مطلوب ہے تو ان کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ بحرانوں کو قابو کرنے کے بارے میں کچھ نہیں سوچا جاتا' بلکہ انھیں ٹالا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ "بین الاقوامی اقتصادی نظام" میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔ شمال اور جنوب کے درمیان مذاکرات اور مباحث اگرچہ بہت دھواں دھار رہے ہیں' لیکن نتیجے کے اعتبار سے امید کی کوئی کرن سامنے نہیں لاتے۔ درحقیقت اس خوفناک سرنگ کا دوسرا سرا بھی بڑا تاریک ہے۔

اس سے پہلے جو حقائق پیش کیے گئے ہیں' ان کی بنا پر مذکورہ تمام تر نام نہاد ترقیاتی اقدامات سے مسلمان یکسر غیر مطمئن ہیں۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار سے عاری "ترقی" کے فلسفے نے انھیں مزید پریشان کر رکھا ہے۔ اس بے زاری کی گہری جڑیں مغربی ثقافت اور اس کی لادین آزاد روی میں پیوست ہیں۔ اس جعلی ترقی نے مسلمان معاشروں میں انتشار و افتراق کی کیفیت پیدا کر کے قومیتی' علاقائی اور طبقاتی جھگڑوں کو ابھار دیا ہے۔ مکمل طور پر مادہ پرستانہ طرز عمل' اسلامی طریقہ زندگی اور تہذیبی روایات کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام معاشرے کی تشکیل اور اس کی اقتصادی و سماجی زندگی کی تنظیم کرتے ہوئے عدل و انصاف کی قدروں کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ وہ اخلاقی اور مادی حکمت عملی کے ایک حسین امتزاج کے ساتھ زندگی اور اس کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ زندگی کو مذہبی اور دنیاوی طبقوں میں تقسیم کرنے کا ہر خیال اسلام کے لیے ناقابل قبول ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ کھلے لفظوں میں اظہار نہ کرنے کے باوجود مغربی طرز عمل ہر دوسری ثقافت اور سماجی نظام کی تحقیر پر قائم ہے۔ قدم قدم پر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مغربی اقدار اور ثقافتی طور طریقے دیگر قوموں اور لوگوں پر زبردستی تھوپ کر ان کی اپنی ثقافت کو مسخ کیا جائے۔ ایسا کرتے ہوئے یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ "جدیدیت اختیار کرنے کے لیے لازم ہے کہ مغربی فکر کی پیروی کی جائے"۔ یہ سب کچھ ایک

منظم اور مربوط شکل میں "نظریہ انقلاب" کے نام پر پیش کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ جو اقدار اور ادارے مادی مقاصد کے حصول میں معاون ہیں اور مرغوب اور من پسند نتائج دیتے ہیں، وہی سماجی نظام چلانے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس عمل معکوس کے سبب دیرپا انسانی رویوں اور رسم و رواج کی جگہ مادی مسابقت نے لے لی ہے۔ اقتصادی ترقی کے نام نہاد عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے معاشرتی اداروں، باہمی تعلقات کی نوعیت اور انعام و سزا کے طور طریقے تک بدلنا ضروری خیال کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک ترقی کا یہ عمل درحقیقت ثقافتی سامراج کی یلغار ہے۔ ان کے چند بڑے اعتراضات مختصراً درج ذیل ہیں:

۱۔ مغرب کی طلسماتی تحریک کے تحت، مادی خوش حالی کے ادھورے خوابوں نے مسلمان معاشرے میں فکری اور عملی سطح پر زلزلے کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس فکر نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں نقال ذہنیت کو پروان چڑھایا، جو اختراعی جذبے اور تخلیقی صلاحیت کے لیے زہر قاتل ہے۔ اس سے نہ صرف اخلاقی بگاڑ عام ہوا ہے، بلکہ یہ مسلم دنیا پر مغربی استعمار کے اقتدار کو تقویت پہنچانے کا باعث بنا ہے۔ اس سے مغرب اور مغرب زدہ طبقات کا غیر اخلاقی گٹھ جوڑ مضبوط رہا ہے۔ مغرب کی ثقافتی غلامی میں جکڑے تیسری دنیا کے ان ممالک کی کل ترقی، مغربی مال کی کھپت پر منحصر ہے۔

۲۔ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت مغربی ترقیاتی حکمت عملی کے رواج نے مسلمان معاشرے کو کئی زاویوں سے ٹکڑوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس تقسیم میں جدید کے مقابل روایتی، آزاد خیالوں کے مقابل قدامت پسند (فی الحقیقت محتاط)، شہری کے مقابل دیہی، امیر کے مقابل غریب وغیرہ کی منافرت اب عام ہے۔ اس طرز عمل سے نہ صرف سامراجی روایات کی بقا کا اہتمام ہوا ہے، بلکہ ایسی مسرفانہ عادات کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی جس نے جدید طبقے کو باقی معاشرے سے کاٹ کر انھیں مغربی دوستوں کا ہم رنگ بنا دیا ہے۔ یہ مراعات یافتہ اقلیت، امیر تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور عام آبادی غربت کے چنگل میں گرفتار ہے۔ اس عمل سے اقتصادی اور سماجی تضاد نے جنم لیا ہے اور معاشرے میں تصادم اور تناؤ کے نئے نئے محاذ پیدا ہو گئے ہیں۔ زندگی کے طور طریقے اس انداز سے بدل رہے ہیں کہ ایک چھوٹا سا مراعات یافتہ اور شاہ خرچ طبقہ، اپنی ہم وطن آبادی کی عظیم اکثریت پر مسلط ہو گیا ہے۔ اس طبقے کی قدریں اور روایات عوام الناس سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔ قومی خودکشی کی اس دوڑ میں آگے بڑھ جانے والے لوگ اپنے ہم وطن بھائیوں کے دلوں سے دور اور ان کے لیے اجنبی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نام نہاد جدیدیت کا ہر نشان اکثریتی آبادی کی نفرت کا ہدف بن کر رہ گیا ہے۔

۳۔ ترقی کا یہ پورا تجربہ حد درجہ مہنگا اور اسراف پر مبنی ہے۔ درآمدات کا متبادل پیدا کرنے کی نیم

دلانہ کوششیں معیشت کی تکنیکی صلاحیت بڑھانے میں ناکام رہی ہیں۔ جب کہ اس بے سود طرز عمل نے لوگوں کو ایسی غیر ضروری آسایشوں اور طرز زندگی کا عادی بنا دیا ہے، جن کا یہ معاشرہ متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ ان ملکوں میں ایک شاہ خرچ معاشرہ پیدا کیا جا رہا ہے، جہاں بذات خود اشیاے صرف بہت قلیل ہیں۔ اشیا کی پیداوار اور خرچ کے انداز قطعی طور پر بے ہنگم ہو گئے ہیں۔ ان سے صرف مراعات یافتہ اقلیت کی بے جا خواہشات کا اظہار بے لگام امنگوں کی تکمیل کی صورت میں ہو رہا ہے۔ معاشرے کی غالب اکثریت کے لیے یہ سب کچھ کار بے خیر ہے۔

۴۔ بدقسمتی سے معاشرے کے عمومی مزاج میں ایسی بنیادی تبدیلی آ رہی ہے جو لوگوں کو لذت پسند انفرادیت کی طرف لے جا رہی ہے۔ قومی معاشی بنیاد کو مضبوط اور توانا بنانے کے بجائے ذاتی معیار زندگی کو بلند کرنے کی تحریک مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ ہر طرف بخل اور خیانت کے زہریلے کانٹوں کی فصل اگ رہی ہے۔

۵۔ مغربی حکمت عملی کی تہ میں یہ تصور پنہاں ہے کہ اقتصادی ترقی کا عمل، سیاسی نظام، سماجی اداروں اور لوگوں کی اخلاقی تربیت میں مثبت اقدامات کے بغیر بھی جاری و ساری رہ سکتا ہے۔ مفروضہ یہ ہے کہ اقتصادی حالات میں تبدیلی آ گئی تو پھر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف دائروں میں موجود نازک توازن خود بخود اس کے مطابق ڈھل جائے گا۔ حالانکہ اب تک کے نتائج یہ ہیں کہ معاشرہ تقسیم ہوا، انتشار بڑھا اور ابہام، رقابتیں اور بربادیاں عام ہوئیں۔

ان عوامل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرتی اجتماعیت اور سالمیت کو مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا، جو اسلام کے انداز فکر و عمل سے یکسر مختلف ہے۔ اسلامی تصور معاشرت میں زندگی کے ہر پہلو اور شعبے میں ترقی کے اہداف سے ایسا حسین تعلق قائم کیا جاتا ہے جو انفرادی سطح پر ایک کامل شخصیت تشکیل دیتا ہے اور معاشرتی سطح پر عدل و توازن کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔

اقتصادی ترقی کے خالص مادہ پرستانہ تصور کو اسلام مسترد کرتا ہے، کیونکہ اسلام عام محدود معنوں میں مذہب نہیں، بلکہ اس کا اپنا مخصوص اقتصادی اور سماجی پروگرام ہے۔ اس پروگرام کا محور، دنیا کے متعلق اس کا مخصوص زاویہ نظر، خاص اخلاقی قدریں اور منفرد اصول ہیں۔ تاریخی شہادت یہی ہے کہ مغربی افکار و نظریات اور اقدار کو جب بھی زبردستی مسلمانوں کے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی تو نتائج ہمیشہ منفی نکلے۔ جدیدیت نے مسلم معاشرے کے ایک بہت محدود طبقے کو متاثر کیا ہے۔ اسے امت مسلمہ کی عظیم اکثریت میں راستہ بنانے اور جڑیں پھیلانے میں ناکامی ہوئی ہے۔ ایسی تمام کوششیں قطعی طور پر سطحی اور بے ثمر رہی ہیں، کیونکہ ان کا مطمح نظر مصنوعی تبدیلی تھا، اور مصنوعی تبدیلی کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے، اس

لیے ایسی کوششوں کا نتیجہ بھی منفی رہا۔ کئی مغربی ترقیاتی ماڈل اور ادارے ان معاشروں کے لیے کوئی نمونہ نہ بن سکے جنھیں ان کے لیے ماڈل قرار دے کر تھوپا جا رہا تھا۔

مزید برآں، مغرب نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے جن حالات کے تحت مادی ترقی کی، آج کے مسلمان معاشروں کے حالات ان سے مختلف ہیں۔ یہ محض ایک بے کار اور غیر حقیقی تصور ہے کہ ایک خاص تاریخی عہد میں جو کچھ مغرب میں ہوا، وہی دوسری جگہ بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ خود آج کے مغرب میں بھی جدید مغربی نظریات و افکار کے خلاف ردعمل پایا جاتا ہے۔ بالخصوص وہاں کا نوجوان طبقہ زیادہ سے زیادہ ایسی چیزوں اور ایسے کلچر کی طرف راغب ہو رہا ہے، جنھیں "ثقافت دشمن" خیال کیا جاتا ہے۔ منظر کافی تبدیل ہو رہا ہے اور آج کا مسلمان، بالخصوص مسلم نوجوان ایسی چیزوں اور قدروں کو برداشت نہیں کر پا رہا جو مغربی غلبے کی علامت ہیں۔ مسلمان ذہن """مکر کی چالوں" کو سمجھ چکا ہے اور اپنا "نقد حیات" خیالی دیوتاؤں کے لیے لٹوانے کے بجائے، ان کے سراب سے نکل کر معاشی اور سماجی ترقی کی ایک نئی حکمت عملی کی تلاش اور جستجو میں ہے۔ اس کے لیے اقبال کی تلقین ہے:۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر پیدا
تری نسبت براہیمی ہے، معمار جہاں تو ہے

کیا

آپ کے بچے
خون کی کمی کا شکار ہیں ؟

شکریہ ادا کرنا
نیکی کے درخت کو پانی دینا ہے
تاکہ وہ زیادہ پھل لائے

والدین کو یہ حقیقت یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے بچوں کو جو صحت مند خون درکار ہے' وہ ان کی تعریف کرنا ہے' جس میں حوصلہ افزائی کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیے۔

انہیں اس نعمت سے محروم نہ رکھیے!
وہ اس طرح خون کی کمی کا شکار ہو سکتے ہیں!!

اگر ہم تعریف جان دار الفاظ میں کسی قدر زور سے کریں اور تنقید کرتے وقت اپنی آواز کم رکھیں تو ہمارے معاشرے میں محبت اور حوصلہ افزائی کا خون گردش کرنے لگے گا۔

(رہنمائے تربیت' ص ۴۳۷)

(یہی تحریکی ذمہ داروں کے لیے بھی ہے!)

خیر خواہ

اطاعت رسولؐ کا شوق

مولانا عبدالمالک

حضرت عبداللہؓ بن رافع مخزومی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ بیان کیا کرتی تھیں کہ ایک دن وہ ایک خاتون سے اپنے بالوں میں کنگھی کرا رہی تھیں کہ منبر پر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنائی دی: "ایھا الناس" اے لوگو! یہ آواز سنتے ہی انھوں نے کنگھی کرنے والی سے کہا: میرا سر لپیٹ دو۔ اس نے عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں! آپؐ تو لوگوں کو پکار رہے ہیں۔ فرماتی ہیں کہ اس پر میں نے کہا کہ ہائے تیری ہلاکت! کیا ہم 'لوگ' نہیں ہیں؟ چنانچہ اس نے سر لپیٹ دیا۔ پھر حضرت ام سلمہؓ اپنے حجرے میں کھڑے ہو کر آپؐ کا خطاب سننے لگیں۔ آپؐ فرما رہے تھے: لوگو! میں حوض کوثر پر ہوں گا۔ اس دوران تم لوگوں کو مختلف جماعتوں کی شکل میں لایا جائے گا۔ یہاں تک کہ تم حوض کوثر کے قریب پہنچ جاؤ گے تو پھر لوگوں کے راستے مختلف ہو جائیں گے۔ کچھ لوگ حوض کوثر کے بجائے دوزخ کے راستے پر مڑ جائیں گے تو میں تمھیں آواز دوں گا: لوگو! سنو! اس راستے کی طرف آؤ! اس کے جواب میں مجھے پیچھے سے آواز آئے گی کہ انھوں نے آپؐ کے بعد راستہ تبدیل کر دیا تھا۔ تو پھر میں کہوں گا: اچھا تو پھر دفع ہو جاؤ' دفع ہو جاؤ (الفتح الربانی' ج ۱' ص ۱۹۷' ترتیب مسند احمد)۔

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے' اس کی مثال حضرت ام سلمہؓ کے رویے سے ملتی ہے۔ آج رسالوں میں' کتابوں میں' ٹیلی ویژن' ریڈیو پر' دفتروں اور بازاروں میں لگے ہوئے طغروں اور کیلنڈروں میں' نمازوں کے بعد درس حدیث میں غرض جگہ جگہ ہر طرف اللہ کے رسولؐ کے فرمودات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ انھیں توجہ سے سننا اور پڑھنا اور حتی الامکان ان پر اپنی زندگی میں عمل کرنا ہمارا مستقل رویہ ہونا چاہیے۔ حضرت ام سلمہؓ کا رویہ دیکھیے' سب کام چھوڑ کر' محبت و وارفتگی کے ساتھ متوجہ ہو گئیں۔ یہ عشق' یہ شوق اتباع' تقاضائے ایمان ہے۔
- کس کی تمنا نہیں کہ حوض کوثر پر آپؐ کے دست مبارک سے جام نصیب ہو! رسولؐ اللہ اپنی امت کے گروہوں کا ہی ذکر کر رہے ہیں کہ حوض کوثر کی طرف روانہ ہوں گے۔ رسولؐ اللہ ان کے منتظر ہوں

گے لیکن وہ راستہ بدل لیں گے۔ وہ وہاں نہیں پہنچیں گے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مطابق حوض کوثر' کتاب و سنت کی اخروی شکل ہے۔ مسلمان کہلانے کے باوجود کتاب و سنت کے راستے پر نہ چلنے والے' حوض کوثر سے محروم رہیں گے۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن اپنے شیطانوں کو لاغر کرتا رہتا ہے۔ جس طرح تم میں سے ایک آدمی اپنے اونٹ کو سفر کے دوران لاغر کرتا ہے (الفتح الربانی' ج ۱' ص ۱۰۹' ترتیب مسند احمد)۔

● جب اونٹ پر زیادہ سے زیادہ سوار ہو کر لمبا سفر کیا جائے تو وہ لاغر ہوتا ہے۔ شیطانوں کو کمزور کرنے کا بھی یہی راستہ ہے کہ آدمی اس کو اپنی سواری بنائے' اس کے ماتحت نہ ہو' بلکہ اسے اپنے ماتحت کرے۔ شیطان جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے' ان کا کام یہ نہیں کہ وہ مومن پر سوار ہوں بلکہ مومن کی شان یہ ہے کہ ان پر سوار ہو' وہ محکوم ہوں اور مومن ان پر حاکم ہو۔ روز ازل سے انسان اور شیطان میں یہی نزاع ہے۔ انبیا علیہم السلام کا یہی مشن ہے کہ شیطان اور شیطانی قوتوں اور نظاموں کو زیر کیا جائے اور مومن کا بھی یہی کام ہے۔

○

حضرت وھبؓ بن جابر سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کے ایک آزاد کردہ غلام نے کہا: میں اس ماہ (رمضان المبارک میں) یہاں بیت المقدس میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا: اپنے گھر والوں کے لیے اس ماہ کا خرچہ چھوڑا ہے؟ کہا: نہیں۔ آپؓ نے فرمایا: تب اپنے گھر واپس جاؤ اور ان کے لیے خرچے کا انتظام کر کے آؤ۔ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آدمی کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کر دے جن کی خوراک اس کے ذمے ہے (الفتح الربانی' ج ۱۷' ص ۵۷' ترتیب مسند احمد)۔

● گھر والوں کے لیے روز مرہ ضروریات کا انتظام بظاہر ایک "دنیوی" کام ہے۔ (ایک عام ذہن کے مطابق) بھلا اس کا رمضان المبارک میں بیت اللہ' مسجد نبویؐ یا بیت المقدس میں مہینے بھر کے اعتکاف سے کیا مقابلہ! لیکن دیکھیے' ایک صحابیؓ' رسول اکرمؐ کے فرمان کی روشنی میں کیا تعلیم دیتے ہیں۔ دین کا حقیقی فہم یہی جاننا اور اس پر عمل کرنا ہے کہ کسی حکم کا کیا مقام ہے۔ نفل کو فرض سے زیادہ اہم جاننا' دین کا صحیح تصور نہیں ہے۔

○

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ہمارے گھر میں ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپؐ نے ایک شخص کو پراگندہ بال دیکھا تو فرمایا کیا اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کے ذریعے یہ اپنے بالوں کو سنوار لے۔ ایک دوسرے آدمی کو دیکھا کہ اس نے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں' تو اس کے بارے میں فرمایا کیا اسے ایسی چیز نہیں ملی جس کے ساتھ کپڑوں کو دھو ڈالتا (الفتح الربانی' ج ۱۷' ص ۲۳۴' ترتیب مسند احمد)۔

● اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے احکام کی تعمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے میلا کچیلا رہنے اور بالوں کو پراگندہ رکھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ صاف ستھرا رہنے' بالوں کو کنگھی کر کے اور بنا سنوار کر رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ صاف ستھرا' منظم گھر' اجلے کپڑے' کنگھی کیے ہوئے بال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی سنت اور اسلامی تہذیب و ثقافت ہے۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے! اور ہمارے لیے کتنے وسیع امکانات ہیں کہ ہم فطرت سلیم کے تقاضوں کے تحت صاف ستھرا رہنے پر بھی اجر و ثواب سمیٹیں کہ یہ بھی دینی کام ہے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے (افسوس کہ زمانہ نبوتؐ کے بعد کے اَدوار میں' میلا کچیلا اور پراگندہ رہنے کو بزرگی اور آخرت کی راہ سمجھ لیا گیا)۔

○

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو سفید لباس پہنے دیکھا تو پوچھا' عمرؓ! آپ کا لباس نیا ہے یا دھویا ہوا ہے؟ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ حضرت عمرؓ نے کیا جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کا جواب سن کر دعا دیتے ہیں۔ فرمایا: اِلْبَسْ جَدِیْداً وَعِشْ حَمِیْداً وَمِتْ شَہِیْداً' تم نیا لباس پہنتے رہو' زندگی قابل تعریف ہو' تمھیں موت آئے تو اس حال میں کہ شہید ہو۔ اور میرا گمان ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپؓ کو دنیا اور آخرت میں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر دے (الفتح الربانی' ج ۱۷' ص ۲۳۵' ترتیب مسند احمد)۔

● اپنے ساتھیوں کو نیا لباس پہنے دیکھ کر' یا کوئی اور خوشی حاصل ہو تو' دل میں ان کے لیے اچھے جذبات لانا' خوش ہونا' اس کا اظہار بھی کرنا' ان کے لیے دعا کرنا خود رسولؐ اللہ کا طریقہ تھا۔ یہ موقعے زندگی میں ہر ایک کو بار بار ملتے ہیں' انھیں ضائع نہ کریں' تو اس کے خوشگوار اثرات باہمی تعلقات کی گرم جوشی اور روز مرہ زندگی کی برکتوں میں سامنے آئیں گے (حضرت عمرؓ کی زندگی کو دیکھیں کہ آپؐ کی سب دعائیں قبول ہو گئیں)۔

○

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ برگزیدہ لوگوں کو نہ اٹھا لے۔ اس کے بعد گھٹیا لوگ رہ جائیں گے۔ نیکی کو نیکی اور برائی کو برائی نہیں سمجھیں گے (الفتح الربانی' ج ۲۳' ص ۴۵' ترتیب مسند احمد)۔

● اصل ذلت اور گھٹیا پن یہ ہے کہ انسان نیکی کو نیکی اور برائی کو برائی نہ سمجھے۔ نیکی کیا ہے؟ اور برائی کیا ہے؟ اس فلسفیانہ سوال کا ایک مختصر جواب یہ ہے کہ اپنے دل سے پوچھو۔ دل سے صحیح جواب اسی صورت میں ملے گا کہ انسان کی اقدار درست ہوں۔ اقدار بگڑتی ہیں' تو خیر و شر کی تمیز اٹھ جاتی ہے' فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیے اور مسلسل کوشش بھی' کہ معاشرے میں' نیکی کا چلن رہے' بھلائی اور برائی کی تمیز سب کو ہو۔ معاشرے میں نیک اور برگزیدہ لوگ ہوں اور حقیقی عزت بھی انھیں حاصل ہو۔

○

حضرت یزیدؓ بن ابی سفیان سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مجھے شام کا حکمران بنا کر بھیجا تو فرمایا' یزید! تم برادری والے ہو' ہو سکتا ہے کہ تم برادری کے لوگوں کو اپنے ماتحت امارت کے مناصب پر فائز کرنے میں ترجیح دو۔ مجھے تمھارے بارے میں بڑا خطرہ اسی چیز کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جسے مسلمانوں کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا ہو اور وہ ان پر کسی کو عطیہ اور بخشش کے طور پر امیر بنا دے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ یا یوں فرمایا کہ اس سے اللہ عزوجل بری الذمہ ہو گیا۔۔۔ (الفتح الربانی' ج ۲۳' ص ۵' ترتیب مسند احمد)۔

● کوئی بھی عہدہ اور منصب کسی کو محض اس بنیاد پر دینا کہ وہ قرابت دار ہے' جائز نہیں ہے۔ ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ کی لعنت آئی ہے اور لعنت گناہ کبیرہ پر آیا کرتی ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو جو عہدے اور منصب کا اہل نہ ہو' میرٹ پر پورا نہ اترتا ہو' عہدہ اور منصب دینا حدیث کی رو سے گناہ کبیرہ ہے۔

● شریعت میں عہدے اور منصب کا اہل وہ شخص ہوتا ہے جو نیک اور صالح ہو اور جس کام کے لیے اسے عہدہ دیا جائے' اس کو کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ اب تو یہ وقت آگیا ہے کہ قرابت داری تو رہی ایک طرف' رقم لے کر بڑے بڑے عہدے دیے جاتے ہیں۔ ایسے میں معاشرہ فساد سے بھر نہ جائے تو کیا ہو۔

● اسلامی معاشرے میں عدل کا قیام ہماری امنگ اور آرزو ہے۔ مناصب پر تقرر اہلیت و صلاحیت کی بنیاد پر ہو تو اس سے خیر رونما ہوتا ہے' عدل عام ہوتا ہے۔ ہم کو اس کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے اور اب بھی جہاں جتنا اختیار ہے' اس اصول کو اختیار کرنا چاہیے۔

(تدوین و ترتیب : مسلم سجاد)

ماضی قریب کی اسلامی تحریکیں اور سید مودودیؒ کی خدمات

سید جلال الدین عمری

اسلام کے ذریعے دنیا میں جو انقلاب برپا ہوا وہ اپنی نوعیت کا منفرد انقلاب تھا۔ اس طرح کا انقلاب پہلے کبھی چشم فلک نے نہیں دیکھا تھا۔ دنیا کا مشکل ترین کام یہ ہے کہ بھٹکے ہوئے انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیا جائے۔ اس انقلاب کے ذریعے یہی کارنامہ انجام پایا تھا۔ یہ ایک ہمہ جہتی انقلاب تھا۔ یہ انقلاب فکر و نظر کا تھا' تہذیب و معاشرت کا تھا' اور قانون و سیاست کا تھا۔ یہ اتنا بھرپور انقلاب تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اس کے تابع ہو گئے اور جس رنگ میں وہ رنگنا چاہتا تھا' رنگ گئے۔ یہ انقلاب نسل و قوم اور جغرافیائی حدود سے ناآشنا تھا۔ یہ ایک عالم گیر انقلاب تھا۔ اس انقلاب کی پشت پر ایک طرف عقیدہ و فکر کی زبردست قوت تھی جو دلوں کو مسخر کر رہی تھی اور دوسری طرف اسے قوت نافذہ یا سیاسی قوت حاصل تھی جس کی وجہ سے اس کے اصول و نظریات معاشرے میں پوری طرح جاری و ساری رہے اور جہاں کہیں کوئی رخنہ یا شگاف نظر آتا' اسے آسانی سے پر کر لیا جاتا۔ یہ صورت حال جب تک اللہ نے چاہا' جاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ عقیدہ اور فکر مضمحل ہوا' اس کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے اور حکومت اور سیاست پر بھی اسلام کی گرفت ڈھیلی پڑتی چلی گئی۔ اس وقت تجدید و احیاے دین کی ضرورت پیش آئی اور اس سلسلے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ مجددین اور مصلحین امت نے جس دور میں جس طرح کی کمی محسوس کی' اسے دور کرنے کی کوشش کی۔

گذشتہ تین صدیوں کا جائزہ بتاتا ہے کہ اس کار تجدید و اصلاح کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں تحریکیں کام کرتی رہی ہیں اور انھوں نے فکر و عمل پر غیر معمولی اثرات چھوڑے ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی بڑی ہنگامہ خیز ہیں۔ ان میں بڑی زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ایک طرف مغرب' نئے افکار' نئی سائنسی تحقیقات و ٹکنالوجی اور نئے عزائم اور تازہ سیاسی قوت کے ساتھ ابھر رہا تھا اور دوسری طرف مسلمان دینی اور اخلاقی زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ان کی سیاسی قوت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ مغرب کے افکار و تہذیب سے مرعوب اور خوفزدہ تھے اور

سیاسی طور پر اس کی محکومی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا تو معلوم نہیں حالات کیا رخ اختیار کرتے اور مسلمانوں کی محکومی اور پستی اور دین سے دوری کس حد کو پہنچتی۔ لیکن اللہ کا کرم ہے کہ ان ہی صدیوں میں' مسلمانوں میں' آزادی و خود مختاری کا احساس بھی بیدار ہوا اور ایسی تحریکیں بھی اٹھیں جو امت میں دینی روح پیدا کرنا چاہتی تھیں اور اس کی پوری زندگی کو دین کی بنیاد پر منظم کرنے کا منصوبہ رکھتی تھیں۔ یہ تحریکیں دنیا کے مختلف خطوں میں اٹھیں۔ ان سب کے حالات یکساں نہیں تھے۔ اس لیے ان کی کوششوں کا انداز بھی مختلف تھا۔ جن حالات و ظروف سے وہ دوچار تھیں' ان کے لحاظ سے انھوں نے اپنی پالیسی اور لائحہ عمل وضع کیا۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نجدی (۱۷۹۲-۱۷۶۵) نے اپنی اصلاحی اور دعوتی کوششوں کا آغاز کیا تو نجد و حجاز میں' جو کہ توحید کے مراکز تھے اور جہاں سے دنیا کو توحید کا درس ملا تھا' بے شمار بدعات و خرافات اور مشرکانہ اعمال رواج پا گئے تھے۔ شیخ کی توجہ دو باتوں کی طرف تھی' ایک تو یہ کہ بدعات و خرافات کو ختم کر کے اصل توحید کے تصور کو اجاگر کیا جائے اور دوسرے یہ کہ لوگوں کو کتاب و سنت کی طرف رجوع کی دعوت دی جائے۔ انھوں نے اس کے لیے محمد بن سعود کی تائید حاصل کی اور ان کی مدد سے پورے حجاز سے بدعات و خرافات کا خاتمہ ہوا۔ اس کے اثرات بعد کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں پر صاف طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

شیخ محمد بن علی سنوسیؒ (۱۸۵۹-۱۷۸۷) نے حجاز' لیبیا' مصر' سوڈان' الجزائر وغیرہ میں تربیت گاہوں کا' جنھیں "زاویے" کہا جاتا تھا' نظم قائم کیا۔ انھیں وہ اسلامی زندگی کا نمونہ بنانا چاہتے تھے اور فکری اصلاح کے ساتھ عملی تربیت بھی دیتے تھے۔ اس میں فوجی تربیت بھی شامل تھی۔ وہ دنیا کی تعمیر نو کا عزم رکھتے تھے اور اس کے لیے قدیم علوم کے ساتھ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کو بھی ضروری خیال کرتے تھے تا کہ جدید یورپ کا مقابلہ کیا جا سکے۔ لیکن جس عزم و ارادے کے ساتھ وہ اٹھے تھے' اس کے مطابق اقدامات نہیں کر سکے۔ انھوں نے اور ان کے جانشینوں نے بڑی بے جگری سے طویل عرصے تک مغربی استعمار کا مقابلہ کیا لیکن ذہنی و فکری لحاظ سے لیبیا کو مغرب کے اثرات سے نہ بچا سکے اور نہ صنعتی لحاظ سے اسے مغرب کے مقابلے کے قابل بنایا جا سکا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ (ش ۱۸۳۱) کی تحریک میں چند پہلو بہت نمایاں ہیں۔ ان میں سے ایک ہے توحید خالص کا تصور اور اتباع سنت کا جذبہ۔ یہ تحریک جب اٹھی تو ہندستان کے مسلمان عقیدۂ توحید سے منحرف ہوتے جا رہے تھے اور طرح طرح کی بدعات و خرافات میں گرفتار تھے۔ سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں نے ان بدعات اور خرافات پر تنقید کی اور توحید خالص کے تصور اور اس کے تقاضوں کو اجاگر کیا اور

اتباع سنت پر زور دیا۔ اس کے نتیجے میں عملاً بہت سی بدعات اور غیر اسلامی رسوم و رواج کا خاتمہ ہوا۔ اس پہلو سے یہ تحریک شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نجدی کی تحریک سے بہت قریب نظر آتی ہے۔

اس تحریک کی دوسری خوبی یہ تھی کہ اس نے اپنے رفقا اور متاثرین میں تقویٰ اور خدا ترسی کی ایسی روح پھونک دی کہ لوگوں کی زندگیاں بدل گئیں، دین و ایمان کی بہار آگئی اور صحابہ اور تابعین کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ یہ اعلاے کلمۃ اللہ کی تحریک تھی۔ یہ اسلام کو سربلند کرنے اور پورے نظام اسلامی کو زندہ کرنے کی تحریک تھی۔ یہ ایسی سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتی تھی کہ اسلام کے احکام کو نافذ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ افسوس کہ یہ تحریک اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شکار ہوگئی ورنہ کم از کم شمال مغربی ہند کا رخ بدل گیا ہوتا۔ یہ تحریک بظاہر سیاسی طور پر ناکام ہوگئی لیکن اس کے رفقا اور علم بردار ہندستان میں دور دور تک پھیل گئے۔ ان کی کوششوں کے اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

الاخوان المسلمون دور جدید کی بہت ہی منظم اور طاقت ور تحریک ہے۔ اس کے بانی شیخ حسن البنا شہیدؒ (۱۹۰۶-۱۹۴۹) کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اسلامی علوم پر بھی وسیع نظر رکھتے تھے اور دور جدید کے تقاضوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اسلام کو جامد مذہب کی جگہ ایک انقلابی فکر کی حیثیت سے پیش کیا اور بتایا کہ اسلام محض عقائد و عبادات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اخلاق و سیاست، روحانیت و مادیت، تزکیہ نفس، جدوجہد اور جہاد کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے باطل نظام انسان کے جن مادی مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں، اسلام ان مسائل کو ان سے بہتر طریقے سے حل کرتا ہے اور اس کی روح کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر دنیا میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے افراد کی تربیت کی اور انھیں تیار کیا۔ اس تحریک کو شدید آزمایشوں سے گزرنا پڑا۔ افسوس کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں اس تحریک کو سخت نقصان پہنچا۔ اب بھی یہ عالم اسلام کی ایک تسلیم شدہ طاقت ہے۔

تحریک اسلامی: دور جدید کی اسلامی تحریکوں میں "تحریک اسلامی" نسبتاً کم عمر ہے۔ مولانا مودودیؒ نے جس وقت اس کی بنیاد رکھی (۲۶ اگست ۱۹۴۱) مشرق سے مغرب کا سیاسی اقتدار تو ختم ہو رہا تھا لیکن فکری اور تہذیبی اقتدار جوں کا توں باقی تھا۔ ہر طرف سیاسی آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں لیکن جو لوگ یہ تحریکیں چلا رہے تھے وہ مغربی فکر سے متاثر ہی نہیں، بے حد مرعوب بھی تھے۔ وہ اس کی بنیادوں کو مزید مستحکم کر رہے تھے۔ آزادی کے بعد ان کے سامنے ملک و وطن کی تعمیر کا کوئی نقشہ نہیں تھا بلکہ وہ مغرب ہی کے نقشے کو اپنے ہاتھوں نافذ کرنا چاہتے تھے۔ اس پس منظر میں مولانا مودودیؒ کی خدمات کو آسانی سے سمجھا جا

سکتا ہے۔

۱۔ مولانا مودودیؒ نے مغربی فکر کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، اس کی خامیاں واضح کیں تاکہ ذہنوں میں اس سے جو مرعوبیت ہے، وہ ختم ہو۔ انھوں نے ثابت کیا کہ مغربی افکار اور اس کی تہذیبی اقدار کی اساس اس قدر کمزور ہے کہ اس پر کوئی مضبوط عمارت نہیں کھڑی کی جا سکتی۔ جو اس کے پیچھے اپنے مسائل کے حل کی توقعات لے کر دوڑ رہے ہیں، وہ سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، سوائے ناکامی کے کچھ ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

۲۔ مغرب نے اسلام کے عقائد، خدا، وحی و رسالت، آخرت، جنت اور جہنم اور تمام مابعد الطبیعیاتی امور کا مذاق اڑایا تاکہ اسلام کی بنیاد ہی سے یقین متزلزل ہو جائے۔ مولانا محترم نے اپنے زور قلم سے ثابت کیا کہ عقائد اسلام سے ان کے انکار کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے جبکہ عقل سلیم اور انسان کی فطرت ان کی تائید کرتی ہے۔ مولانا کی کتابیں رسالہ دینیات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور اسلامی نظام زندگی میں شامل متعدد مقالات اسی مقصد کے تحت لکھے گئے۔

۳۔ مغرب نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت مذہب کو ایک انفرادی معاملہ قرار دے رکھا تھا، تاکہ وہ مذہب کو اور اس بہانے اپنے سب سے بڑے حریف اسلام کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے عبادت و ریاضت اور چند مذہبی رسومات تک محدود کر دے۔ مغرب کے اس نقطہ نظر کو دنیا نے عملاً قبول بھی کر لیا۔ مولانا مودودیؒ نے پوری قوت کے ساتھ کہا کہ خدا اور بندے کے تعلق کو عبادت تک یا انسان کی نجی زندگی تک محدود کر دینا خلاف عقل ہے۔ خدا ہے تو وہی ہماری پوری زندگی کا جائز حکمراں ہے۔ کسی دوسرے کی حکومت زندگی کے کسی بھی شعبے میں ناجائز ہے۔ اسلام صرف عبادات اور اخلاقیات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک انقلابی فکر ہے جو پوری زندگی پر حکومت کرتی ہے۔ کسی دوسرے کے اقتدار کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مغرب نے اسلام کی بعض تعلیمات کو اپنی تنقید کا خاص نشانہ بنایا اور اس کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی تاکہ اسلام سے وابستگی آدمی کے لیے عزت اور فخر کا باعث نہ ہو بلکہ وہ اس سے ندامت اور شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ مولانا مرحوم نے الجہاد فی الاسلام، ضبط ولادت، پردہ، قتل مرتد کی سزا جیسی بے نظیر کتابیں تصنیف کر کے اور اپنے مقالات میں غلامی، تعدد ازدواج اور قانون وراثت جیسے موضوعات پر مدلل بحث کر کے ان کوششوں کو ناکام بنایا اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کی۔ اسی طرح بہت سے مسائل میں خود مسلمانوں کا ذہن صاف نہیں تھا۔ مولانا نے تفہیمات اور تنقیحات کے ذریعے اسے صاف کرنے کی

کوشش کی۔

معاشیات کے میدان میں اشتراکی فکر چھائی ہوئی تھی۔ ترقی پذیر ممالک کسی اور فکر کے بارے میں سوچ بھی نہیں پا رہے تھے۔ ترقی یافتہ ممالک سرمایہ داری کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ مولانا مودودیؒ نے ایک طرف تو ہیگل اور مارکس کے فلسفے پر تنقید کر کے بتایا کہ اشتراکیت کی فکری بنیاد کس قدر کمزور ہے، دوسری طرف سرمایہ داری کے نقصانات سے بھی باخبر کیا۔ اس کے ساتھ مولانا نے بتایا کہ اسلام معاشیات کے ایسے متوازن اصول پیش کرتا ہے جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کے نقصانات سے پاک ہیں۔ اس کی تفصیل ہمیں **اسلام اور جدید معاشی نظریات، سود، مسئلہ ملکیت زمین** اور اس موضوع سے متعلق بعض مقالات میں ملتی ہے۔

سیاست کے میدان میں مغربی جمہوریت سے آگے کوئی شخص سوچنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مولانا نے سیکولر ڈیموکریسی پر زبردست تنقید کی اور اسلام کے سیاسی نظریے کو بہت تفصیل سے اور پوری استدلالی قوت کے ساتھ پیش کیا۔ مولانا کی یہ تحریریں ہمیں ان کی کتاب **اسلامی ریاست** میں ملتی ہیں اور اسلامی ریاست پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، اس کتاب میں ان کا بھی جواب دیا گیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کی علمی خدمات میں **تفہیم القرآن** ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں مولانا کی پوری فکر سمٹ آئی ہے۔ اس میں مغرب کے فلسفوں پر علمی اور سنجیدہ تنقید ہے، اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب ہے اور اس طرح یہ اسلام کی ہمہ جہتی، دل نشین اور واضح تشریح ہے۔

مولانا مودودیؒ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے بعض موضوعات بالکل نئے ہیں اور بعض وہ ہیں جن پر مولانا سے پہلے یا بعد میں کام ہوا ہے لیکن مولانا کے قلم کی بعض خصوصیات انھیں دوسری تحریروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہاں ان کی طرف بھی اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ مولانا مودودیؒ کے نزدیک دین ایک "کل" ہے۔ اس کا ہر جز منطقی طور پر اس سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ اس کو الگ کر کے دیکھنے سے اس کی حقیقی تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی بلکہ بعض اوقات شدید غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ مولانا اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ اسلام کے کسی بھی جز کے حقیقی ثمرات اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ اس "کل" کو اختیار کیا جائے۔

۲۔ مولانا کا انداز خالص علمی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا جرات مندانہ ہوتا ہے۔ وہ مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں اور اس کی کمزوریوں اور خامیوں کو اس طرح بے نقاب کرتے ہیں کہ آدمی اس کی عظمت کا قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

مولانا کے ہاں جدید فکر پر جتنی شدید اور بے لاگ تنقید ہے' کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے ملے گی۔

۳۔ مولانا کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے آفاقی پہلو کو بہت نمایاں کیا ہے۔ دنیا بین الاقوامیت کے ہزار دعوؤں کے باوجود آج بھی نسل پرستی' قوم پرستی اور وطن پرستی کی بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکی ہے۔ وہ ان ہی دائروں میں رہ کر اپنے مسائل کا حل ڈھونڈتی ہے۔ مولانا اسلام کو اس حیثیت سے پیش کرنے میں کامیاب ہیں کہ وہ کسی گروہ یا فرقے کا نہیں' ساری نوع انسانی کا دین ہے۔ دنیا کے ہر فرد اور ہر گروہ کی نجات اسی سے وابستہ ہے۔ انھوں نے برصغیر کے مخصوص حالات میں اپنے کام کا آغاز کیا اور اس کے لیے ایک نقشہ کار بھی پیش کیا لیکن اسلام کی یہ آفاقیت ہمیشہ ان کے سامنے رہی اور وہ پوری دنیا کے لیے اسلام کے داعی بن کر ابھرے۔

مولانا مودودیؒ کا کام صرف علمی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ انھوں نے اسلام کو قائم اور غالب کرنے کے لیے عملاً جدوجہد شروع کی اور اس کے لیے ایک منظم تحریک برپا کی۔ مولانا نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ اسلام کوئی قومی مذہب نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا دین ہے اور اس کے ماننے والے ایک امت ہیں۔ یہ امت دین ہی کے اصول و نظریات کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ جو شخص ان نظریات پر ایمان لے آئے وہ اس کا جز اور اس کا فرد بن جاتا ہے۔ اس امت کا فرض ہے کہ اپنے چھوٹے بڑے اختلافات کو فراموش کر کے دین کی سربلندی کے لیے متحد ہو جائے اور اپنے فکر و عمل سے اس کی شہادت دے۔

مولانا مودودیؒ کی ان علمی کوششوں کو ان کی برپا کردہ تحریک اسلامی نے آگے بڑھایا ہے۔ جن پہلوؤں پر مولانا کام نہیں کر سکے تھے ان پر کام ہوا ہے' جن موضوعات کی طرف صرف اشارات کیے جا سکے تھے ان کی تفصیل اور وضاحت کی جا رہی ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو دور جدید کی اسلامی تحریکوں میں جماعت اسلامی اپنے علمی سرمائے کے لحاظ سے کافی آگے نظر آتی ہے۔ پورے عالم اسلام میں بلکہ پوری دنیا میں احیاے اسلام کی جو کوششیں ہو رہی ہیں' ان میں اس سرمائے سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

"تفہیم القرآن" اور صاحبِ تفہیم القرآن

سید حامد عبدالرحمٰن الکاف

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن پاک و ہند میں اور ان سے باہر پائے جانے والے اردو داں طبقات میں ایک بہت ہی جانی پہچانی، معروف اور متداول تفسیر ہے۔ یہ تفسیر نہ صرف دانشوروں اور پڑھے لکھے طبقات میں مقبول ہے بلکہ اس کی قبولیت عام کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہر روز سیکڑوں مقامات پر یہ اجتماعات میں یا تو درساً درساً پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے یا پھر اس کو پڑھ کر حاضرین کو جن میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے ہیں، سنایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ساری دنیا میں --- اجتماعی اور انفرادی طور پر --- پڑھے جاتے ہیں۔ نہایت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آج ساری اردو تفسیروں میں یہ تفسیر سب سے زیادہ شائع ہوئی ہے۔

اس تفسیر اور ترجمہ کی امتیازی خصوصیات بیان کرنے سے قبل ہم کچھ صاحب تفہیم القرآن کے بارے میں بیان کریں گے۔

سید مودودیؒ نے محرم ۱۳۵۲ھ (اپریل ۱۹۳۳ء) میں، حیدر آباد دکن کے رسالہ ترجمان القرآن کی ادارت سنبھالی جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔ اسی رسالے نے اس اسلامی انقلابی تحریک کے لیے زمین ہموار کی جو تحریک "جماعت اسلامی" کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ یہ وہ عظیم تحریک ہے جس نے اسلام کو نہ صرف نظریاتی سطح پر ایک نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا بلکہ اس نے اس کو عملاً نافذ کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد بھی کی۔ ان مبارک کوششوں کے اثرات فکری اور عملی حیثیتوں سے ساری دنیا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آخری سانس تک سید مودودیؒ کسی نہ کسی جہت سے اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

شخصی خصوصیات

صاحب تفہیم القرآن کی شخصیت جن نمایاں اوصاف سے عبارت تھی، ان میں چند قابل ذکر اوصاف درج ذیل ہیں:

خدمت قرآن

ابتدا ہی سے صاحب تفہیم القرآن کا ہدف قرآن کریم کی خدمت تھا۔ چنانچہ ترجمان القرآن کے پہلے "اشارات" میں جس کو انھوں نے "فاتحہ" کا نام دیا' یہ اعلان کیا:

ترجمان القرآن کے مقاصد میں سے ایک اہم اور ضروری مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو قرآن کے سمجھنے میں مدد دی جائے۔ اس مقصد کے ذیل میں ان شکوک و شبہات کا ازالہ بھی تھا جو قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ترجمان القرآن میں ایک مستقل باب ہو گا جس میں ہر شخص کو اپنی مشکلات اور اپنے شبہات پیش کرنے کا حق ہو گا اور حتی الامکان ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

رسالے کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہوتی تھی: "علوم و معارف قرآنی اور حقائق فرقانی کا ذخیرہ"۔

صاحب ترجمان کے نزدیک قرآن مجید کا منصب و مقام کیا تھا' اسے انھی کے لفظوں میں نقل کرتا ہوں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

جاہلیت کے زمانے میں' میں نے بہت کچھ پڑھا ہے' قدیم و جدید فلسفہ' سائنس' تاریخ' معاشیات' سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں' مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا' سب ہیچ تھا۔ علم کی جڑ اب ہاتھ آئی' کانٹ' ہیگل' نطشے' مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے' ان کو اس کتاب نے ایک دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے؟ میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے' حیوان سے انسان بنا دیا ہے' تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی' ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں' حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کنجی کو "شاہ کلید" (master key) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے' سو میرے لیے یہ قرآن "شاہ کلید" ہے۔ مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے' اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔ (مکتوب بنام سید ابوالحسن علی ندوی' ۳۱ اگست ۱۹۴۰)

قرآن کی تعلیمات پر عمل

ایک سوال یہ ہے کہ مولانا نے قرآن کو "شاہ کلید" تو قرار دیا ہے مگر کیا انھوں نے اس "شاہ کلید" کی تعلیمات پر عمل بھی کیا' کیوں کہ عمل ہی قول کے صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے؟

ان کلمات کے لکھنے سے چند ماہ قبل مولانا رحمتہ اللہ علیہ کو ایک امتحان سے گزرنا پڑا۔ یہ امتحان ان "اشارات" کی وجہ سے دینا پڑا جو انھوں نے جنگ عظیم دوم میں برطانیہ کے داخلے اور اعلان جنگ پر لکھے تھے۔ یہ "اشارات" سنسر ہو گئے اور اس ماہ کا ترجمان سادہ اور غیر مطبوعہ صفحات کے ساتھ شائع ہوا۔ صرف یہ آیت کریمہ لکھی ہوئی تھی:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ (الروم ۳۰: ۴۱)۔

خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا' شاید کہ وہ باز آئیں۔

اس سنسر کی داستان اس زمانے کے سنسر نمبرا نے' جو بعد میں میاں عبدالحمید ایڈیٹر پاکستان ریویو کی حیثیت سے مشہور ہوئے' یوں بیان کی ہے کہ جب مولانا مودودیؒ سے معافی --- حتیٰ کہ صرف زبانی معافی چاہنے کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے کہا:

> میں نے قرآنی تعلیم' تاریخ اسلام اور تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھ کر اظہار خیال کیا ہے..... رہی بات مجھے وارننگ کی تو میں اسے پرکاہ بھی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نے قرآن کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوڑا ہے اور نہ چھوڑوں گا..... آپ مجھے کہتے ہیں کہ میں معافی مانگوں' یہ ناممکن ہے۔ آپ کی حکومت مجھے تختہ دار پر لٹکا دے' عمر قید کر دے' نظر بند کر دے' میں کبھی معافی نہ مانگوں گا (قومی ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۰' ص ۲۲۴)۔

یہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ کی بات ہے۔ اس جواب نے حکومت برطانیہ کو خاموش کر دیا اور یہ کیس فائل ہو گیا۔

قرآنی تعلیمات پر جماعتی اور قومی سطح پر عمل

مولانا مودودیؒ نہ صرف شخصی دائرہ عمل میں قرآن کے دامن کو تھامے ہوئے تھے بلکہ انھوں نے پہلے جماعتی سطح پر اور بعد میں پاکستان میں قومی سطح پر قرآن کو انفرادی' جماعتی اور ملکی سرگرمیوں کا محور اور رہنما بنایا اور بنانے کی جدوجہد کی۔

(الف) --- اس بات کا پہلا موقع اس وقت آیا جب دارالاسلام پٹھانکوٹ کے قیام کے لیے مولانا حیدر آباد دکن سے ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ کو پٹھانکوٹ منتقل ہوئے۔ جس کا نقشہ انھوں نے دارالاسلام کی اسکیم کے

تحت رسالہ دارالاسلام جلد ا' شمارہ ا' ستمبر ۱۹۳۹ء (رجب ۱۳۵۸ھ) میں صفحات ۱۲-۱۳ پر پیش کیا تھا (تذکرہ سید مودودی' اول' ص عکس ۸)۔

(ب)--- دوسرا موقع جماعت اسلامی کی تاسیس اور دستور جماعت کی منظوری کا تھا' جو یکم شعبان ۱۳۶۰ھ (۲۶ اگست ۱۹۴۱) کو پیش آیا۔ اس میں جماعت کا دستور منظور ہوا۔ اس میں توحید کی تشریح کی گیارھویں شق یہ ہے:

اپنے اخلاق میں' برتاؤ میں' معاشرے اور تمدن میں' معیشت اور سیاست میں' غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت اور صرف اس کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کو ضابطہ تسلیم کرے اور ہر اس طریقے کو رد کر دے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو۔

ان ہی امور کو رسالتؐ کی تشریح کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے جبکہ "مطلوبہ لازمی تغیرات" کے تحت ان (۷) لازمی تبدیلیوں کا ذکر ہے جو لازماً ہر اس شخص کو اپنی زندگی میں کرنی ہوں گی جو تحریک اسلامی سے وابستہ ہو گا۔

یہ تھی سید مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے ہاں "عمل" کی اہمیت۔

(ج)--- ریاستی سطح پر قرآن اور سنت پر عمل کا مسئلہ اس وقت پیش آیا جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان وجود میں آیا۔ ٹھیک چار ماہ بائیس دن کے بعد ۶ جنوری ۱۹۴۸ کو مولانا مودودیؒ نے لا کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں ایک تقریر کی جس کو دستور اسلامی کی تدوین کے عنوان کے تحت بعد میں شائع کیا گیا۔ اس میں مولانا نے اسلامی قانون کے مصادر اور ماخذ: کتاب' سنت' اجماع اور اجتہاد وغیرہ پر بحث کی۔ پھر ۱۹ فروری ۱۹۴۸ کو اسی لا کالج میں اسلامی دستور کی تنفیذ کے عنوان پر ایک اور تقریر کی جس میں دستور کی تنفیذ کے مختلف مراحل کا تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ جماعت اسلامی نے ملک گیر دستوری مہم کا آغاز کیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ:

(۱) ملک کا قانون شریعت پر مبنی ہو گا' (۲) کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جائے گی جو شریعت کے احکام یا اصول کے خلاف ہو' (۳) تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائے گا جو شریعت کے احکام یا اصول سے متصادم ہوں' (۴) حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ ان برائیوں کو مٹائے جنھیں اسلام مٹانا چاہتا ہے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنھیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے۔

اسی اثنا میں ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ کو کراچی بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر سید مودودیؒ نے اسلامی ریاست کی بنیادیں پر اظہار خیال کیا۔ اس کو ان دو لیکچروں کا تتمہ کہنا چاہیے جو لا کالج لاہور میں ۱۹۴۸ میں دیے گئے تھے۔ ۱۹۵۲ ہی میں وہ دستوری تجاویز' مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے دستور ساز اسمبلی کو پیش کیں جو چھپ کر

مقبول عام ہو چکی تھیں۔ پھر ۳۱ علما کے "بنیادی اصول" اور "دستوری ترمیمات" وغیرہ پیش ہوئیں۔

دستوری جدوجہد--- یا کش مکش --- کا ایک اور پہلو سنت کی آئینی حیثیت اور حجیت، یعنی انکار حدیث کے فتنے کا سدباب کرنا اور اسی سکے کے دوسرے رخ، انکار ختم نبوتؐ کا سدباب کرنا بھی تھا۔ جہاں تک فتنہ انکار حدیث کا تعلق ہے تو یہ محاذ بالکل ابتدا ہی سے ترجمان القرآن میں کھل چکا تھا اور آخری دن تک جاری رہا۔ رہا فتنہ انکار ختم نبوتؐ تو اس میں مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ انھوں نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور سزائے موت، عمر قید بامشقت میں تبدیل کر دی گئی۔

بہت کم لوگوں کو "انکار حجیت حدیث" اور "انکار ختم نبوتؐ" کے باہمی ربط کا احساس ہے۔ یہ اس دین کو "سیکولر مسیحیت" کی شکل میں ڈھالنے کی استعماری کوششوں کا نتیجہ ہے تاکہ شریعت، شرعی احکام اور اس دین کے نظام کو اس "خاص صبغتہ اللہ" سے "آزاد" کر لیا جائے جو سیرت رسولؐ اور سنت رسولؐ، اسلامی زندگی کے ہر گوشے، ہر پہلو اور ہر جز میں دیتی ہے تاکہ اس کے بعد مغربی مسیحی اصباغ (paints) کے ذریعے نام نہاد "اسلامی" زندگی اور نظام کی زینت اور آرایش، حسب مزاج، حسب ضرورت اور حسب طلب کی جا سکے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے ذکر کے بغیر یہ تذکرہ نامکمل رہے گا۔ تاسیس جماعت کے وقت جو کچھ سرمایہ تھا، وہ سب کا سب مولانا مودودیؒ کا مہیا کیا ہوا تھا کیونکہ انھوں نے **الجہاد فی الاسلام**، رسالہ **دینیات** (اردو انگریزی)، **پردہ**، **حقوق الزوجین** اور **تفہیم القرآن** کے علاوہ اپنی ساری کتابیں اور ان کی کل آمدنی پہلے دارالاسلام اور پھر جماعت اسلامی کے لیے وقف کر دی۔

ہم نے ان تفصیلات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید قطب رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ساتھ عصر حاضر میں سید مودودیؒ ہی ایک ایسا تنہا مفسر قرآن ہے--- جس نے قرآن کریم اور حامل قرآن کریمؐ کی تعلیمات کو انفرادی، جماعتی اور حکومتی و ریاستی سطح پر نافذ کرنے کے لیے پوری زندگی جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں ان کو جیل خانوں کی ہوا بھی کھانی پڑی اور پھانسی کے تختے تک بھی جانا پڑا۔ اس راہ میں ان پر گولیاں بھی چلائی گئیں۔ جھوٹے الزامات سننا اور برداشت کرنا تو ایک عام بات تھی۔

یہ وہ اہم ترین سبب ہے جو صاحب تفہیم کو نہ صرف عصر حاضر بلکہ پچھلی کئی صدیوں تک کے مفسرین میں وہ امتیازی مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے جو سید قطب رحمتہ اللہ علیہ کے علاوہ کسی اور کے نصیب میں نہیں لکھا گیا تھا۔ اس وجہ سے ان دونوں مجاہدین حضرات کی تفسیریں پچھلی کئی صدیوں میں لکھی ہوئی تفسیروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کو ان سارے شدائد و مصائب اور مراحل اور ان تمام سرد و گرم معاملات سے عملاً گزرنا پڑا جن سے اسوہ رسولؐ کی اتباع میں داعیان حق کو گزرنا پڑتا ہے۔ ان تجربات و مشاہدات، شدائد و مصائب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسات اور جذبات کا عکس ان دونوں تفسیروں میں بالکل

واضح طور پر پایا جاتا ہے جو کسی اور تفسیر میں موجود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے نازل کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے اسرار و رموز صرف ان لوگوں پر کھلتے ہیں اور کھولے جاتے ہیں، جو اسوہ رسولؐ کی اتباع میں ان سارے شدائد، مراحل اور مصائب سے گزریں جو مکہ مکرمہ، طائف اور حبشہ میں یا مدینہ منورہ، تبوک، موتہ اور حنین میں پیش آتے رہے ہیں۔ جب کبھی ان میں سے کسی مرحلے، واقعے، ابتلا، فتح، ہزیمت، سازش، تکلیف یا مصیبت سے پالا پڑے گا، اس کی مناسبت سے آیات، سورتیں اور ان کا مفہوم خود بخود سمجھ میں آتا رہے گا۔ یہی اس کتاب دعوت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے (فی ظلال القرآن، سید قطب، ج ۳)۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کیا اس سے مستثنیٰ ہیں؟ عرض یہ کرنا ہے کہ ان حضرات کی بھی بڑی گراں قدر خدمات ہیں مگر اپنے دور کے مخصوص حالات کی وجہ سے انھوں نے کوئی ایسی تحریک نہیں چلائی تھی کہ اس سے ان کے معاشروں میں انقلابی تبدیلی رونما ہو سکتی۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تفسیری خدمات اور کاوشیں قابل قدر ہیں اور منفرد اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم دور جدید میں فی ظلال القرآن اور تفہیم القرآن کا اپنا ہی منفرد مقام ہے۔

رہا شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ کا معاملہ، تو ان کو ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کی تعلیمات کا تسلسل کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ پھر انھوں نے محمد بن سعودؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی دعوت کو ایک طرح سے سیاسی مدوجزر کے حوالے کر دیا جس کے نتائج آج کل تو بالکل ہی کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ اب اسلام اور علماے اسلام حکومت کے تابع دار ہیں، نہ کہ حکومت اور حکام، اسلام اور علما کے تابع دار ہوں۔ اگرچہ امام محمد بن عبدالوہابؒ کے دور میں علما کا بھی ایک مقام تھا جو ملوک کے برابر نہ سہی مگر عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اب تو یہ بات بھی قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔

تفہیم القرآن کی امتیازی خصوصیات

یہاں تک ہم نے صاحب تفہیم القرآن کی بعض اعتقادی، فکری اور عملی خصوصیات کی وضاحت کی ہے۔ اب خود تفہیم القرآن کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

۱- **سلسلہ وار اشاعت:** تفہیم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو سب سے پہلے ماہنامہ ترجمان القرآن میں قسط وار شائع کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر عام قارئین کو اور علما کرام کو اور دوستوں اور دشمنوں کو اس کے عیوب اور محاسن کو جاننے اور ان کے بارے میں کلام کرنے بلکہ نشان دہی کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح صاحب تفہیم کو اپنے ترجمہ، ترجمانی اور تفسیری حواشی پر انتقادات کی روشنی میں بار بار غور کرنے اور ان کو بہتر سے بہتر بنانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ یہ تفسیر فکر و نظر اور تنقید و تنقیص کی چھوٹی بڑی

چھلنیوں میں چھن چھن کر بہت کچھ نکھر گئی ہے۔

یہ سلسلہ مولانا نے ترجمان القرآن کے شمارہ محرم ۱۳۶۱ھ مطابق فروری ۱۹۴۲ء، جلد ۲۰، عدد ۱ سے شروع کیا۔ اس طرح یہ سلسلہ مولانا کی زیر ادارت نکلنے والے ترجمان کے نویں سال کی ابتدا سے شروع ہوا۔ اس ۹ سال کے عرصے میں:

(الف)--- متحدہ ہندستان میں صاحب ترجمان ایک بلند پایہ عالم دین اور صاحب بصیرت سیاست دان اور ترجمان القرآن ایک باوقار اور سنجیدہ دینی ماہنامے کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔

(ب)--- ۱۹۳۷ کے آخر میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش جلد اول اور ۱۹۳۸ کے آخر میں اسی کی جلد دوم اور پھر ۳۹-۱۹۴۰ میں مسئلہ قومیت شائع ہو چکے تھے۔ ان کتابوں نے مولانا کو ایک صاحب بصیرت رہنما کی حیثیت سے ہندستان کے طول و عرض میں مشہور کر دیا تھا، مگر ابھی تک مولانا کا اپنا کوئی مستقل لائحہ عمل اور پلیٹ فارم کسی کے سامنے نہیں آیا تھا۔

(ج)--- مثبت فکری اور عملی کوشش تاسیس جماعت اسلامی کے دن سے شروع ہوئی جو یکم شعبان ۱۳۶۰ھ (۲۶ اگست ۱۹۴۱ء) تھا۔ اس روز مولانا کی راہ عمل بالکل واضح ہو کر ایک جماعتی پروگرام کی شکل اختیار کر چکی تھی اور اس کے چار ماہ بعد ترجمان القرآن میں یہ سلسلہ شروع کیا گیا جبکہ وہ تحریک اسلامی کے قائد بن چکے تھے اور اسلام کی طرف دعوت دینے کی وجہ سے ان کو ان مراحل، مشکلات اور مصائب سے گزرنا پڑ رہا تھا جو کسی بھی قائد تحریک اسلامی کو پیش آنے ضروری تھے اور ہیں۔

اسباب بالا نے تفہیم کو صرف نظری، علمی، کلامی، منطقی، تفسیر نہیں رہنے دیا، جیسا کہ اس زمانے میں اور آج بھی ان تفسیروں کا حال ہے جو محض "علمیت" ثابت کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں بلکہ وہ ایک تحریکی --- اور سب سے پہلی تحریکی تفسیر--- بن گئی اور یہی اس کی سب سے بڑی، اہم اور امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوام عطا کرے گی ان شاء اللہ۔ کیونکہ وہ بہت عرصے تک تحریک اسلامی کے قائدین اور کارکنوں کے لیے، ساری دنیا میں، تحریکی رہنما کی حیثیت سے پڑھی، پڑھائی اور پھیلائی جائے گی۔

اس کا دوسرا تابناک پہلو یہ ہے کہ قرآن کی دوسری تحریکی تفسیر--- عربی زبان میں پہلی تحریکی تفسیر--- فی ظلال القرآن خود قرآن کی زبان میں ہونے اور سید قطبؒ جیسے نادر زمانہ ادیب، شاعر اور نقاد کے نوک قلم سے لکھے جانے اور سرخ اور گرم گرم خون شہید کی لال روشنائی سے لکھے جانے کی وجہ سے صاحب تفہیم کے سارے ہی اہم دینی، سیاسی، معاشی، اقتصادی، اجتماعی اور معاشرتی افکار و آرا کو زندہ و جاوید کر چکی ہے۔ مختصراً یہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں (الٰہ، رب، عبادت اور دین)، سود، الجہاد فی

الاسلام، تفسیر سورۃ النور وغیرہ میں وارد افکار کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

یوں تفہیم، سید مودودیؒ کی تحریکی آرا اور افکار کو تاقیامت متحرک رکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔ یہ امتیاز نہ تو کسی پچھلے مفسر یا تفسیر کو حاصل ہے اور نہ مستقبل میں کسی اور تفسیر اور مفسر کو حاصل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ○ (الحدید ۵۷:۲۱) "یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑا فضل والا ہے"۔

(د)---- ایک خصوصیت، جو امتیازی حیثیت کی حامل ہے، وہ تفہیم القرآن کا "مقدمہ" ہے جو مولانا نے نیو سنٹرل جیل، ملتان، پاکستان میں لکھا (۱۷ ذی القعدہ ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء)۔ اس طرح محرم ۱۳۶۱ھ سے جو کام شروع کیا گیا اور جو سورۃ یوسف تک پہنچا اس کو دیکھنے اور اس پر نظرثانی کرنے کی فرصت بھی قائد تحریک اسلامی کو اس وقت ملی جب کہ وہ سنت یوسفی پر عمل پیرا تھے۔ اس طرح تفہیم جلد اول، جو سورۃ الانعام تک ہے اور تفہیم جلد دوم کے نصف تک مولانا نے ترتیب جدید اور نظرثانی کا کام جیل اور جیل کی فضا اور اس طوفانی اور تند و تیز ماحول میں کیا جو دستوری مہم کو موت کی نیند سلانے کے لیے مسئلہ کشمیر کے ذریعے کھڑا کیا گیا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ "سنت یوسفی" کی سعادت بابرکات صرف بلند اقبال اور خوش نصیب لوگوں کو ہوتی ہے اور جب وہ تجربات، احساسات اور غیر متزلزل ایمان و یقین میں ڈھل جاتی ہے تو شراب دو آتشہ بن کر اہل ایمان کو ثبات علی الحق کے عجیب و غریب دروس دیتی ہے۔

(ح)---- جیل کی نظرثانی کردہ سورتوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قرآن کریم کی سب سے طویل سورتیں ہیں جن کا عمود، محور یا مرکزی مضمون دریافت کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔

چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ جو نظم قرآن کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں، تدبر قرآن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> اس میں شبہ نہیں کہ بعض بڑی سورتوں، مثلاً بقرہ اور آل عمران میں بظاہر نظم کی جو مشکلات نظر آتی ہیں، چھوٹی سورتوں میں اس طرح کی مشکلات نہیں ہیں، خاص طور پر بقرہ تو سمجھیے کہ ہمت شکن ہے۔ تدبر قرآن، ج ۱)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے سید مودودیؒ پر اپنی کتاب کے اسرار کس طرح کھولے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نظم قرآنی کے بارے میں کوئی دعویٰ کیے بغیر اس نے فتوحات ربانیہ کے زیر اثر، نظم قرآن کی بڑی بڑی گتھیاں لمحوں میں سلجھا دیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوع کی مناسبت سے قرآن کی ایک چھوٹی اور سب سے بڑی سورت کے

نظم کے بارے میں مودودی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر مفسرین کی آرا نقل کر دی جائیں۔ یہ سورتیں الفاتحۃ اور البقرہ ہیں۔

سورہ فاتحہ کا نظم اور اس کا ربط و تعلق

سید مودودیؒ : سورہ فاتحہ ایک دعا ہے بندے کی جانب سے، اور قرآن اس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۳۲)۔

اس طرح قرآن ایک رہنما کتاب قرار پاتا ہے جس سے اس زندگی میں راہیں تلاش کرنی چاہییں۔ نظم کے لحاظ سے بعد کی ساری ہی سورتیں، پورا قرآن، سورہ فاتحہ کے مضامین اور مطالب سے مربوط ہیں۔ خیال رہے کہ سید مودودیؒ نے اس کو "دیباچہ" یا "آغاز کلام" قرار دیا ہے۔

امین احسن اصلاحیؒ : اس سورہ کا اسلوب دعائیہ ہے (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۲)۔ سورہ پر دعا کے پہلو سے ایک نظر ڈالیے تو پورے قرآن سے اس سورہ کا تعلق ظاہر ہو گا۔ سورہ فاتحہ کے آخری حصے اور سورہ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اس کے جواب یا ایک دعا اور اس کے اثر اور اس کی قبولیت میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورت کو قرآن مجید کی ترتیب میں بھی دیباچہ قرآن کی جگہ دی گئی ہے (تدبر قرآن ج ۱، ص ۲۷)۔

سید قطب شہیدؒ : وہ یہ کہنے کے بعد کہ اس سورت کی پہلی پانچ آیات توحید، ربوبیت جمیع الخلائق، ایمان بالآخرہ جیسے بنیادی اسلامی تصورات پر دلالت کرتی ہیں، یوں رقمطراز ہوتے ہیں: اسلامی تصورات میں ان بنیادی کلیات کو مضبوطی سے قائم کرنے کے بعد اور اس بات کو گہرائی عطا کرنے کے بعد کہ صرف اللہ ہی کی طرف عبادت اور طلب مدد کے لیے رخ پھیرنا چاہیے، ان امور کی عملی تطبیق کی طرف پہلا قدم اللہ سے دعا کے ذریعے اٹھایا جاتا ہے۔ ایک ایسی کلی اور شامل دعا جو اس سورت کے مزاج اور فضا سے مناسبت رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس سورت کا مزاج اور فضا، سب کے سب دعا سے عبارت ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں (فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۳۶)۔

الجلالین: ان معنی میں اس تفسیر میں کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا ہے۔

الکشاف: اس تفسیر میں صرف ایک مقام پر "اهدنا" کے مقام پر یہ آیا ہے کہ امر اور دعا کا صیغہ ایک ہی ہوتا ہے کیونکہ دونوں طلب پر دلالت کرتے ہیں لیکن اس سے اس سورت کے دعا ہونے پر روشنی نہیں پڑتی ہے۔

یہ آرا اس حقیقت کو کھول کر بیان کرتی ہیں کہ سورہ فاتحہ کو طلب ہدایت کی دعا اور باقی قرآن کو ہدایت اور رہنمائی سے عبارت جواب دعا صرف سید مودودیؒ نے پہلی بار بیان کیا اور ان ہی کی طرح مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے بھی یہی بات کہی ہے۔

عربی زبان میں پہلی تحریکی تفسیر لکھنے والے ہونے کی حیثیت سے سید قطبؒ نے اپنے ممدوح بلکہ استاذ مودودیؒ کی بات کہی ہے گو بغیر اس علم کے کہ سید مودودیؒ نے ایسا کہا ہے۔ اس کو توارد فکری اور توارد خواطر کہتے ہیں۔ اس سے سید مودودیؒ اور سید قطبؒ میں فکری ہم آہنگی اور مشابہت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سورہ بقرہ کا بعد کی سورتوں سے تعلق

سید مودودیؒ: دلچسپ چیز یہ ہے کہ سید مودودیؒ نے اس سورت کے "عمود" اور مرکزی مضمون کو سورہ کی ابتدا میں نہیں بلکہ آخر میں اور صحیح تر الفاظ میں اس کے آخری رکوع کے شروع میں بیان کیا ہے: یہ خاتمہ کلام ہے۔ اس لیے جس طرح سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا' اسی طرح سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی ان تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا' جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے۔ تقابل کے لیے اس سورہ کے پہلے رکوع کو سامنے رکھ لیا جائے تو زیادہ مفید ہو گا (تفہیم القرآن ج ۱' ص ۲۲۲)۔

ان چند کلمات میں سید مودودیؒ نے نہ صرف عمود بیان کیا ہے بلکہ اس سورت کا ایک وحدت ہونا بھی ثابت کیا ہے یعنی اس طویل اور بقول مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے "خاص طور پر بقرہ تو سمجھئے کہ ہمت شکن مشکلات کا مجموعہ ہے" کو انھوں نے (یعنی مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے) ایک وحدت گردان کر از اول تا آخر ایک مربوط اور سلیس عبارت سمجھ کر ---- جس میں کہیں تعارض نہیں اور جھول نہیں ---- اس کی تفسیر کر دی۔ رہے اس کے مطالب اور مضامین جو اس عمود یا محور یا مرکزی مضمون کے مختلف پہلوؤں سے مربوط ہیں اور جن کو مربوط کرنے ہی میں کسی مفسر کی شان تفسیر پنہاں ہے' ان کو انھوں نے شان نزول ---- تاریخی پس منظر ---- کے چار نکات میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی یہود سے کش مکش' نوزائیدہ مملکت اور معاشرے کی تنظیم کے ابتدائی احکام' نئی ریاست کی بقا کے لیے ضروری جوش و خروش پیدا کرنا' جو انفاق الاموال اور انفاق الارواح پر منتج ہوتا ہے یعنی تعلیم جہاد اور منافقین اور ان سے لمبی کش مکش کی ابتدا (تفہیم القرآن' ج ۱' ص ۳۶-۳۸)۔

امین احسن اصلاحیؒ: اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوت ایمان ---- گویا سورہ فاتحہ میں ایمان باللہ کا ذکر ہے اور سورہ بقرہ میں ایمان بالرسالت کا (تدبر قرآن' ج ۱' ص ۳۱)۔

سورہ بقرہ کے مطالب کا ذکر مجملاً سورہ میں خطاب کے عنوان کے تحت آیا ہے۔ یہود سے خطاب' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب' مسلمانوں سے خطاب۔ پہلی جماعت کا عناد اور سازشیں' نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کو صبرو استقامت کی تعلیم، مسلمانوں کو امت وسط کی ذمہ داریاں اٹھانے کی تلقین اور یہود سے سبق لینے کا حکم (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۳۲)۔

سید قطب شہیدؒ : مولانا مودودیؒ کی طرح انھوں نے اس کا عمود یا محور آخر میں اور آخری رکوع کو بنیاد بنا کر یوں بیان کیا ہے: یہ وہ خاتمہ سورہ ہے جو خود سورت کا خلاصہ بیان کرتا ہے اور عقیدہ کا خلاصہ بتاتا ہے اور مومنین کے تصور کی تلخیص بیان کرتا اور ہر لمحے ان کے اپنے رب کے ساتھ حال کی وضاحت کرتا ہے (فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۳۴۷)۔

سورت کے موضوعات اور مطالب کے ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ: وہ دو ایسے دھاگوں سے عبارت ہیں جو اپنے محور سے بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دھاگہ تو یہود، منافقین اور مشرکین کی چالوں اور سازشوں سے عبارت ہے اور دوسرا دھاگہ اسلامی جماعت کی مدینہ میں ایک ریاست کی شکل میں تاسیس اور اس کی مطلوبہ صفات جو خلافت کی امانت کو اٹھانے کے لیے مطلوب ہیں اور ان کو ان اسباب سے آگاہ کرنے سے عبارت ہے جو یہود کے منصب امامت سے معزولی کا سبب بنے ہیں (فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۲۸)۔

اگر اس عمود اور ان موضوعات کا سید مودودیؒ کے عمود اور نکات سے مقابلہ کیا جائے تو یوں محسوس ہو گا کہ یہ ان کی صحیح تصویر بلکہ عکس ہیں درآنحالیکہ تفہیم کا ترجمہ نہ اس وقت تک ہو پایا تھا اور نہ آج بھی ہو سکا ہے۔ تحریکی تفسیر سے پیدا ہونے والا یہ عجیب توارد فکر اور اتحاد خواطر ہے۔ **واللہ علٰی کل شئی قدیر**۔

الجلالین: اس میں عمود اور موضوعات و مطالب کے بارے میں کچھ مواد نہیں پایا جاتا ہے۔

الکشاف: اگرچہ زمخشری نے اس سورت میں نظم کے بارے میں دو جگہ اشارتاً کلام کیا ہے۔ مگر انھوں نے الم ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ کو حسن نظم کا موجب اس حیثیت سے قرار دیا ہے کہ وہ ہم آہنگی کے ساتھ بغیر کسی حرف نسق (یعنی حروف عطف) کے اس طور پر بھائی چارگی کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے ہیں، کامل اتحاد کے ساتھ۔ پھر متقین کی صفات کے بیان کے بعد ان کے مخالف صفات لوگوں کا ذکر کر کے کلام میں تسلسل قائم کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

سورہ بقرہ کی ایک آیت کا مشکل نظم

سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۸ "حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" (اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو)، نکاح، طلاق، رضاعت اور ان عورتوں کے حقوق جن کے شوہر مر چکے ہوں اور مطلقات کے عام حقوق کے ذکر کے درمیان وارد ہوئی ہے، اس کی کیا حکمت ہے؟ اس

کا کیا مقام ہے؟ اس کا اگلی پچھلی آیات سے کیا ربط ہے؟ اس سلسلے میں ان حضرات کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

سید مودودیؒ: قوانین تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکام الٰہی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخرکار اسی نافرمانی کی رو میں بہہ نکلتا ہے جس میں یہودی بہہ گئے (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۸۲)۔

پھر اس کے بعد تین آیات (۲۴۰-۲۴۲) کے بارے میں لکھتے ہیں:

سلسلہ تقریر اوپر ختم ہو چکا تھا۔ یہ کلام اس کے تتمہ اور ضمیمے کے طور پر ہے (ایضاً، ص ۱۸۳)۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس آسانی، مہارت اور غیر محسوس انداز میں انھوں نے اس آیت کا نظم، محل وقوع اور اگلی اور پچھلی آیات سے ربط و ضبط کھول کھول کر بیان کر دیا۔

امین احسن اصلاحی: گویا خاتمہ باب کی اصل آیت: حافظوا .... " والی ہے۔ اب اس باب کے آغاز پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اس کے آغاز میں توحید کے ذکر کے بعد احکام شریعت کے سلسلے میں سب سے پہلے آیت ۱۷۷ میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ یہاں دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس باب کا خاتمہ نماز کے ذکر پر ہوا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دین میں جو اہمیت نماز کی ہے وہ دوسری کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ ساری شریعت کا قیام و بقا اسی کے قیام و بقا پر منحصر ہے...." (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۵۰۵)۔

سید قطب شہیدؒ: ان آیات (۲۲۲-۲۴۲) کی تمہید کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ظلال کے پہلے ایڈیشن میں لکھا تھا کہ: میں ایک عرصے تک، احکام معاشرہ سے نماز کی حفاظت تک تبدیلی آیات پر غور کرتا رہا مگر اس کا راز مجھے معلوم نہ ہو سکا اور جو کچھ اس سلسلے میں بعض تفسیروں میں آیا ہے اس سے میں مطمئن نہیں تھا (مذکورہ ایڈیشن کے صفحات ۶۸-۶۹)۔ لیکن اب میں اس تفسیر و توجیہ سے بالکل ہی مطمئن ہوں جو یہاں میں نے بیان کی ہے (فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۲۳۸)۔

فائدے سے خالی نہ ہو گا اگر ہم اس کو حرف بہ حرف نقل کر دیں۔ پہلے انھوں نے ان بارہ احکام کو تسلسل سے بیان کیا جو ان آیات میں وارد ہوئے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں:

ان احکام پر عمومی تعقیب یہ ہے: یوں اللہ اپنی آیات کو تم پر واضح کرتا ہے شاید کہ تم غور و فکر کر سکو۔ یہ سب کچھ عبادت ہے۔ شادی بیاہ میں اللہ کی عبادت، جنسی اتصال اور تناسل میں اللہ کی عبادت، طلاق اور انفصال میں اللہ کی عبادت، عدت اور رجعت (شوہر کی طرف واپسی) میں اللہ کی

عبادت، خرچ میں اور سامان ساتھ کرنے میں طلاق کے بعد اللہ کی عبادت، اچھی طرح ساتھ رکھنے اور زندگی گزارنے یا اچھے انداز میں بیوی کو چلتا کرنے میں عبادت، فدیہ دے کر (برے شوہر سے جان چھڑانے) اور بری عورت سے معاوضہ طلب کرنے میں عبادت، دودھ پلانے اور ماں سے علیحدہ ہونے میں عبادت۔ غرض ہر حرکت اور ہر سوچ میں اللہ کی عبادت۔ پھر ان احکام کے اثنا میں اور بیچ میں حالت خوف اور حالت امن میں نماز کا حکم آتا ہے، اور قبل اس کے کہ یہ سیاق ختم ہو تا کہ نماز کی عبادت کو زندگی کی دیگر عبادات میں جوڑ اور سمو دیا گیا۔ یہ ایک ایسا جوڑ اور امتزاج ہے جو اسلام کے مزاج سے ابھرتا ہے اور اسلامی تصور میں انسانی وجود کے مقصد سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ سیاق خود اس مضمون کا الہام کر رہا ہے۔ بڑے ہی لطیف انداز میں کہ یہ سب کی سب عبادت ہیں اور ان میں اللہ کی اطاعت اسی اطاعت کی طرح ہے جو نماز میں واقع ہوئی ہے اور یہ کہ زندگی ایک وحدت ہے۔ اور وہ طاعتوں کے مجموعے سے عبارت ہے اور سارے ہی احکام اللہ کی طرف سے ہیں اور یہ زندگی کے لیے اللہ کا دستور و نظام ہے (فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۲۳۸)۔

خوف طوالت سے میں اس کلام کو یہاں نہیں نقل کر رہا ہوں جو انھوں نے تفصیلی تفسیر میں لکھا ہے اور جو اس کی مزید تشریح ہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات اس جلد کے صفحہ ۲۵۸ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

اب اگر اس عباداتی کلام اور عباداتی عبارت کا سید مودودیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کے کلام سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سید قطب رحمتہ اللہ علیہ ان دونوں سے بھی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ یہ نظر اول میں محسوس ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور عبادت انھوں نے سید مودودیؒ کے تصور عبادت سے لیا ہے جو انھوں نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سید قطبؒ نے اس نادر زمانہ کتاب اور اس کے مصنف کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا کو "المسلم العظیم" کے خطاب سے یاد کیا ہے (فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۱۹۰۲)۔ اس عبارت کے اس جامع و مانع تصور کا سہرا سید مودودیؒ کے سر باندھا جانا چاہیے جو حقیقت کے عین مطابق ہے۔ واللہ لا یستحی من الحق۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سید قطب رحمتہ اللہ علیہ نے سید مودودیؒ کی فکر کو خلود کی دنیا کا ستارہ بنا دیا ہے۔

الجلالین: اس میں نظم آیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

الزمخشری: اس میں نظم آیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا ہے۔

۲- تفسیر کے بنیادی اصول و تصورات پر لٹریچر : تفہیم القرآن کی دوسری اہم امتیازی

خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مصنف نے تمہیداً اس کے لیے کچھ دوسری کتابیں لکھی ہیں جن میں مذکورہ افکار و آرا و تحقیقات اور نتائج اس تفسیر کے بنیادی اصول و مبادی اور تصورات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کے نام یہ ہیں: دین حق، اسلام اور جاہلیت، الجہاد فی الاسلام، دینیات، جہاد فی سبیل اللہ، سود، حقوق الزوجین اور سب سے بڑھ کر قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں جس نے فی ظلال القرآن کا روپ دھار کر سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ کی فکر کو عربی زبان اور قرآن عربی کے ذریعے خلود بخشا ہے۔

۳- **تفسیری مقاصد کی خاطر ارض قرآن کا سفر :** **تفہیم القرآن** کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مصنف نے قرآن میں مذکور امتوں اور مقامات اور ان سے وابستہ تاریخی، فکری، دعوتی نتائج کو چشم سر سے دیکھ کر سمجھنے کے لیے ان مقامات کا طویل اور جاں گسل سفر کیا جس کی داستان میرے قابل احترام دوست عاصم الحداد مرحوم نے **سفرنامہ ارض القرآن** کے نام سے لکھی ہے جس کے نتائج ہم ان نقشوں اور تصویروں میں دیکھ سکتے ہیں اور ان تبصروں میں پڑھ سکتے ہیں جو مولانا محترم نے ان مقامات کے بارے میں لکھے ہیں۔

علم ارض القرآن، جس کے مصادر میں بہت سے مسلمان اور غیر مسلم دونوں مصنفین کی کتابیں شامل ہیں اور مشاہدہ ارض القرآن کے ذریعے مولانا نے مغربی مصنفین اور مستشرقین کے افترات اور جھوٹے دعووں کا پول کھولا ہے۔ ان تنقیدی تبصروں کا مقام علمی اور مشاہداتی ہونے کی وجہ سے بہت اونچا ہو گیا ہے۔ اس سفر میں مولانا نے بحرین، الخبر، الدمام، القیق، الریاض، الدرعیہ، وادی حنفیہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، الطائف، الاردن، الشام، فلسطین و قدس اور مصر و سینا میں واقع تاریخی قرآنی اور سیرتی مقامات کا مشاہدہ کیا اور ضروری نوٹس لکھے۔ دینی، سیاسی اور علمی شخصیات سے ملاقاتیں کیں، اسلام اور امت مسلمہ کے مسائل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ نوجوانوں کو اسلام کے لیے متحرک کیا اور حکام کو ان کی ذمہ داریاں سمجھانے کی کوشش کی۔ اپنے افکار کو کتابوں کے ذریعے اور تقریروں اور سوال و جواب کے ذریعے عام کیا۔ غرض اس سفر مبارک سے بہت سے دینی، علمی اور قرآنی اور سیرتی فوائد حاصل ہوئے۔

تکمیل بحث کے لیے یہاں اس امر کا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مولانا کو ارض احقاف، ارض سبا اور ارض تبع کی زیارت اور مشاہدہ کا موقع نہیں ملا۔ یہ سب مقامات یمن میں واقع ہیں۔

راقم السطور نے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور فضل سے ارض سبا کا سفر ۱۹۸۹ میں کیا اور اس کے مشاہدات اور متعلقہ آیت کی مناسب تشریح اور تفہیم کو اپنے سفرنامے **ارض مارب کا سفر اور مشاہدات** کے عنوان کے تحت ہفت روزہ **الاعتصام** لاہور میں پانچ قسطوں میں شائع کیا۔ اس سے قرآن کے طالب علموں کو کچھ نہ

کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔

عصر حاضر میں پاک و ہند کے مفسرین میں سے شاید ہی کسی نے محض تفسیری مقاصد کی خاطر ارض قرآن کا سفر کیا ہو، یہ شرف صرف سید مودودیؒ کو حاصل ہے۔

سیرتی پہلو سے بھی اس سفر کے خوشگوار اور دل خوش کن نتائج سیرت سرور عالم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۴۔ فہرست موضوعاتی قرآن : تفہیم القرآن کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ پہلی بار قرآنی موضوعات اور مباحث کی اتنی مفصل فہرستیں تیار ہو کر شائع ہوئیں۔ اس کے بعد اب رواج ہو گیا ہے کہ مفصل فہارس مباحث قرآن تیار کیے جائیں جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تدبر قرآن میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ساتھ یوں ہوا کہ اس کے مصنف کو خود یا اپنی نگرانی میں اپنی تفسیر کی چھ جلدوں کی، جو ۴ ہزار سے زائد (۴۰۱۲) بڑی تقطیع اور چھوٹے عربی ٹائپ کے صفحات پر مشتمل ہے، فہرستیں تیار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک فہرست جس کے مرتب محمد علی قطب ہیں اور جس کا نام انھوں نے فہارس فی ظلال القرآن رکھا ہے، بہت ناکافی ہے اگرچہ وہ ۲۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

اردو تفاسیر کی فہارس مطالب قرآن کے بارے میں ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی کا تبصرہ معلومات افزا ہے جس میں تفہیم کے انڈکس اور اس کی تلخیص بقلم استاذی و مخدومی مولانا صدر الدین اصلاحی کے قلم سے اور اس کا حروف تہجی پر مبنی انڈکس اور تفہیم کی ۶ جلدوں "فہرست موضوعات قرآنی" کا ذکر آیا ہے۔ ان سب کے ذریعے مضامین قرآنی بحوالہ تفہیم القرآن نکالنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔

ہر جلد کے ساتھ مفصل فہرست موضوعات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مطلوبہ مقالات پر مفسر کی رائے معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے۔ اس طرح عہد جدید کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

تربیت و تزکیہ

تربیت کا عمل اور طریقہ کار

عبدالرشید صدیقی

تربیت اور تزکیہ نفس کے لیے عملی طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟ اپنے نفس کی اصلاح کا نقطہ آغاز کیا ہو؟ کن ذرائع سے مدد حاصل کی جائے؟ یہ وہ "شاہ کلید" ہے جس کے ذریعے انسان تزکیہ نفس کی شاہراہ پر کامیابی کے ساتھ قدم بڑھا سکتا ہے۔ اس بارے میں اہم نکات پیش ہیں۔

۱۔ **اصلاح قلب:** تزکیہ کا آغاز اپنے دل کی اصلاح سے ہوتا ہے۔ "قلب" کی اصطلاح قرآن و حدیث میں کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ اس سے محض وہ دل جو خون کو گردش میں لاتا ہے، مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اطلاق انسان کی پوری شخصیت، اس کی نفسیات، اس کی خواہشات، اس کی عقلی اور دلی وابستگی اور وہ تمام امور جن سے وہ متاثر ہو کر کسی کام کو کرتا یا کسی امر سے اجتناب برتتا ہے، پر ہوتا ہے۔ اس کی ایک جامع تشریح خرم مرادؒ نے اپنے مضمون اپنی تربیت کیسے کریں؟ میں یوں فرمائی ہے:

> ایک چیز جس کی تمھیں ہر مقصد کے حصول کے لیے ضرورت ہوگی، وہ تمھاری اپنی شخصیت ہے۔ شخصیت کا لفظ ہم وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ تمھارا جسم، تمھاری عقل، تمھاری معنوی صلاحیتیں، تمھارا دل، تمھارے جذبات، تمھارا کردار، تمھارے اخلاق غرض ہر چیز شخصیت میں شامل ہے (ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۴۶)۔

قرآن حکیم کی رو سے انسان کی فلاح کا دارومدار قلب سلیم پر منحصر ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الشعراء ۲۶:۸۸-۸۹)

اس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔

قلب کی اس اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (بخاری)۔

خبردار انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اگر یہ صحیح و سالم ہے تو تمام جسم صحیح و سالم ہے، اگر یہ فاسد ہے تو تمام جسم فاسد ہے۔ دیکھو یہ دل ہے۔

قرآن مجید واضح طور پر یہ نشان دہی کرتا ہے کہ برائی کی اصل جڑ انسان کے قلب میں ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا: فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ (البقرہ ۲:۱۰) "ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے"۔ زندگی میں تمام فساد اسی قلب کے فساد سے رونما ہوتے ہیں۔

فَاِنَّہَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ○ (الحج ۲۲:۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں' روہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

چنانچہ تزکیہ نفس کی ابتدا دل کی پاکیزگی اور صفائی سے کرنا چاہیے۔ اس سے انسان فلاح حاصل کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَخْلَصَ اللّٰہُ قَلْبَہٗ لِلْاِیْمَانِ وَجَعَلَ قَلْبَہٗ سَلِیْمًا (رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان)۔

اس نے یقیناً فلاح پائی جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لیے خالص کر دیا اور جسے قلب سلیم عطا فرمایا۔

پھر انسان کا دل ہمیشہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اس لیے دائماً" ہدایت پر قائم رہنے کی جدوجہد کرنی چاہیے اور بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا (آل عمران ۳:۸)

اے پروردگار، جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔

سرور کائنات یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے:

یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ (ابن ماجہ، مسند احمد)۔

اے دلوں کو گردش دینے والے! ہمارے دل کو اپنے دین پر قائم و برقرار رکھ۔

۲۔ **ذکر و عبادات:** اپنے دل کو ہمیشہ یاد الٰہی سے معمور رکھنا چاہیے۔ نسیان اور غفلت انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کی قربت کا شعور ہر وقت انسان کے

ذہن میں موجود رہے۔ تمام عبادات کا مقصد اصلاً یہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں۔ چنانچہ نماز کے بارے میں فرمایا: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) "اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو"۔ جمعہ کا خطبہ بھی ذکر اللہ ہے (الجمعۃ ۶۲:۱۰)۔ یہ ذکر نہ صرف مخصوص عبادات کی حد تک محدود ہے' بلکہ زندگی کے ہر لمحے اور اس میں پیش آنے والے تمام ہی واقعات اور حوادث میں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا مقصود ہے۔

الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ (ال عمرٰن ۳:۱۹۱)

جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

ثابت بنانیؒ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ میرا رب کب مجھے یاد کرتا ہے۔ لوگ ڈر گئے اور پوچھا یہ کس طرح آپ کو معلوم ہو گا؟ آپ نے یہ آیت تلاوت کی: فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (البقرہ ۲:۱۵۲)' (لہٰذا تم مجھے یاد رکھو' میں تمھیں یاد رکھوں گا)۔

حدیث قدسی میں یہ ارشاد ہے:

میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں۔ میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ جب وہ اپنے دل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اپنے نفس میں اسے یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ کسی مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجلس (یعنی ملائکہ) میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔

یہ انسان کی سربلندی کے لیے کتنا قابل فخر مقام ہے کہ اللہ اسے یاد کرے اور ملائکہ کی مجلس میں اس کا ذکر خیر ہو۔

جہاں ذکر کی یہ عظمت اور برکت ہے وہاں اس سے غفلت مہلک اور باعث ذلت اور گم نامی ہے۔ جو اللہ کو بھول جاتے ہیں اللہ ان کو بھلا دیتا ہے (التوبہ ۹:۶۷) اور پھر اللہ انھیں خود ان کے اپنے نفس میں بھلا دیتا ہے (الحشر ۵۹:۱۹)۔ یعنی خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح میں مصروف ہے۔ چنانچہ فرمایا: سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید ۵۷:۱)۔ جب انسان اللہ رب العزت کے ذکر' اس کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوتا ہے تو وہ تمام کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کے لیے خیر و فلاح کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔

ذکر کو تمام زندگی میں سمو دینے کی ضرورت ہے۔ محض مخصوص اوقات میں گوشہ خلوت میں تسبیح خوانی سے ذکر کا حق ادا نہیں ہوتا۔ نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج' اس ذکر کی عملی تربیت گاہیں ہیں۔ پھر ذکر صرف زبانی ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں انسان کے ذہنی قویٰ بھی مصروف ہوتے ہیں۔ اس میں فکر بھی شامل ہے۔ چنانچہ

سورہ آل عمران کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے' اس میں ذکر کے فوراً بعد یہ فرمایا:

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

(آل عمران ۳:۱۹۱)

اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار' یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب' ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

لہٰذا ذکر وہی نافع ہوتا ہے جس میں فکر شامل ہو اور اس فکر سے آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا ہو اور پھر عذاب جہنم سے بچنے کی کوشش میں سرگرم عمل ہو۔

عبادات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید سے گہرا تعلق ذکر الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو خود ذکر سے تعبیر کیا ہے۔ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ (الانبیاء ۲۱:۵۰) "یہ بابرکت ذکر ہے"۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (الحجر ۱۵:۹) "ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے"۔ اور اس ذکر کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بھی بنایا ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○ (القمر ۵۴:۱۷) "ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے' پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟" اس لیے قرآن مجید کی حضور دل کے ساتھ تلاوت اور اس پر فکر و تدبر کرنا تزکیہ نفس کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔

ان کے علاوہ دیگر دعائیں' اذکار مسنونہ جو مختلف مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہیں' ان کا مقصد بھی اس بات کی یاد دہانی ہے کہ زندگی کے ہر اہم موڑ پر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور مسلسل اس تعلق کو استوار رکھے۔ یہ اذکار محض زبانی نہیں ہیں بلکہ ان کا اظہار فکر و عمل سے ہونا چاہیے۔

جہاد کے سلسلے میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (الانفال ۸:۴۵) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو' توقع ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو گی"۔ ثابت قدمی سے اللہ کی یاد کا مقصد یہی ہے کہ جہاد میں سرگرم عمل رہو۔

سورہ المنٰفقون میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں" (۶۳:۹)۔ اس کے معاً بعد یہ آیت آئی ہے' وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (المنٰفقون ۶۳:۱۰) "جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے"۔ ظاہر ہے یہاں ذکر سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ کی یاد کا تقاضا یہی ہے

کہ انسان اپنی موت کو یاد رکھے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔

تمام عبادات جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کی ہیں، ان کا مقصود ہماری تربیت ہے۔ ان میں ہماری تمام بنیادی کمزوریوں کا کارگر علاج مضمر ہے۔ ان پر حصول تزکیہ کی نیت سے عمل پیرا ہو کر انسان فلاح کی منزل پا سکتا ہے۔

نسیان انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ نماز اس غفلت کا موثر علاج ہے۔

انسان دنیوی زندگی اور اس کی چمک دمک سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ مال جمع کرنے اور مال کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ اور انفاق اس کا علاج ہے۔

انسان اپنے نفس کی خواہشات سے مغلوب رہتا ہے۔ اسے کھانے پینے، آرام کرنے اور شہوت نفس کو پورا کرنے سے آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ روزہ ان خواہشات پر انسان کو کنٹرول کرنا سکھاتا ہے۔ حج کے ذریعے ان تمام ہی امراض کا علاج کیا جاتا ہے اور یوم آخرت کا نقشہ حج کے ذریعے موثر طور سے ذہن انسانی پر ثبت کیا جاتا ہے۔

۳۔ **اخوت، رفاقت اور صحبت صالح**: تزکیہ نفس کی راہ طویل اور مشکلات سے بھری ہوئی ہے۔ انسان تنہا اس راہ میں زیادہ عرصہ استقامت نہیں دکھا سکتا۔ ہم خیال ساتھی اور رفیق اس کٹھن راہ کو طے کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ ان سے مشکلات سے گزرنے میں مدد اور معاونت حاصل ہوتی ہے اور انسان کی ہمت و قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب حالات ناساعد ہوتے ہیں تو دوسروں کی عزیمت و استقامت ہمت بندھاتی ہے۔ اس لیے کہ "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں"۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ ۹:۷۱)، سورہ الحجرٰت میں تو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹:۱۰) کہہ کر اخوت کے رشتے میں جوڑا گیا ہے۔ عقیدہ اور فکر کی یگانگت اس بات کی متقاضی ہے کہ تحریک کے ساتھیوں میں اخوت و محبت ہونی چاہیے اور وہ ایک دوسرے کے لیے رحم اور مواسات کے رشتے سے جڑے ہوئے ہوں۔ رُحَمَآءُ بَيْنَھُمْ --- الفتح)۔ چنانچہ حدیث نبویؐ میں اس کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا: "تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو" (مسلم)۔

ہم خیال ساتھیوں کی رفاقت کتنی ضروری ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْھَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْھُمْ (الکہف ۱۸:۲۸) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو"۔

یہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں انسان کو اپنے قریبی لوگوں سے کٹ کر غیروں سے جڑنا پڑے۔

اگرچہ طبیعت پر یہ بات ناگوار ہی ہو لیکن جہادِ نفس کے لیے یہ ہجرت بھی کرنی پڑتی ہے۔

شیخ سعدیؒ نے جو یہ بات فرمائی ہے کہ صحبت صالح ترا صالح کند، حقیقت پر مبنی ہے۔ یعنی نیکی کی راہ اختیار کرنا ہے تو خدا کے نیک اور بزرگ بندوں کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔ دور حاضر کے ماہرین عمرانیات اور نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ اپنے ہم عمر دوستوں کا اثر انسان کے اخلاق و عادات کو ڈھالنے میں سب سے زیادہ موثر عنصر ہے۔

رسولؐ اللہ نے ہمیں آگاہ کیا کہ آدمی کا دین اور طور و طریق دراصل وہی ہوتے ہیں جو اس کے دوستوں کے ہوں۔ اس لیے آدمی کو اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ کن لوگوں سے دوستی اور صحبت رکھتا ہے۔

حضرت شیخ علی ہجویریؒ اپنی معرکتہ الارا تصنیف **کشف المحجوب** میں یہ حکایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا، اور یہ دعا کر رہا تھا: اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اِخْوَانِیْ (اے اللہ! میرے بھائیوں اور دوستوں کو نیک بنا دے)۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس مقدس مقام پر پہنچ کر تو اپنے لیے کیوں نہیں دعا کرتا؟ اپنے بھائیوں اور دوستوں ہی کے لیے کیوں دعا کر رہا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: میرے جو بھائی ہیں میں انھی کے پاس لوٹ کر جاؤں گا۔ اگر وہ نیک و صالح ہوئے تو میں بھی ان کی صحبت میں نیک و صالح بن جاؤں گا اور اگر وہ مفسد و بدکار ہوئے تو ان کے ساتھ میں بھی ویسا ہی ہو جاؤں گا۔

۴۔ **دعوت:** علم کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان تدریس میں مصروف ہو کیونکہ جب اس علم کو نہ صرف سمجھنے بلکہ سمجھانے کا مرحلہ درپیش ہو گا تو لازماً انسان اس موضوع پر مسلسل غور و فکر کر کے اس علم کے رموز و حقائق کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح جس راہ دعوت کو ہم نے اپنے لیے صحیح سمجھا ہے اور اس پر گامزن ہیں، اسے دوسروں تک پہنچانا وہ فطری طریقہ ہے جس سے انسان کی تربیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے خانقاہوں میں چلہ کشی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انسان کا اپنا گھر، ماحول اور دوست و احباب ہی اس کی تربیت گاہ بن جاتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا اگرچہ اصل مقصد دوسروں تک بات پہنچانا ہوتا ہے لیکن اس کا فائدہ آدمی کو خود اپنی اصلاح کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ اس بات کو مولانا مودودیؒ نے بڑے حکیمانہ انداز میں یوں فرمایا ہے:

> تبلیغ حق کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس میں مشغول ہو، اس کی اپنی ذات پر وہ حق خود بخود طاری ہوتا چلا جاتا ہے جس کی تبلیغ میں وہ سرگرم ہوتا ہے۔ اس کا چرچا کرنے، اس کی اشاعت کی راہیں تلاش کرنے، اس کی تائید میں دلائل ڈھونڈنے اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کرنے کی فکر جتنی زیادہ اس کو لاحق ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ وہ اس میں مستغرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہ تبلیغ اس

کی تکمیل میں ایک اور طرح سے بھی مددگار ہوتی ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ اپنی پوری زندگی خدا کی بندگی میں دے دو' اپنی زندگی سے تضاد اور منافقت کو دور کرو اور جاہلیت کے ایک ایک اثر کو اپنے اندر سے نکالو تو اس کے گردوپیش کی دنیا میں سے سیکڑوں نگاہیں خوردبین لگا لگا کر اس کی اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیتی ہیں اور اس کی کوئی خامی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی نشان دہی کرنے سے زبانیں چوک جائیں۔ اس طرح ایک آدمی کو مانجھنے اور صاف کرنے میں بہت سے بندگان خدا' دانستہ یا نادانستہ لگ جاتے ہیں۔ جو اپنے ناقدین کی اس خدمت بے مزد سے فائدہ اٹھاتا ہے' اس کی تکمیل آپ سے آپ ہوتی چلی جاتی ہے (تحریک اور کارکن' ص ۱۰۳-۱۰۴)۔

اس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اپنی تربیت اور اصلاح کا فطری طریقہ کار یہی ہے کہ انسان دعوت و تبلیغ میں سرگرم ہو جائے۔ پھر اسے کسی اور تربیت گاہ کی حاجت نہیں رہتی۔ سیرت سازی کے سارے پروگرام صرف اس ایک عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

۵- **اجتماعی زندگی - اصلاحی تنقید :** ایک اسلامی نظم جماعت سے منسلک ہو کر جب انسان اجتماعی زندگی گزارتا ہے تو اس کی وہ صلاحیتیں جو منظم کام کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں' نشوونما پاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک فرد تزکیہ نفس کی اعلیٰ منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن محض افراد کی انفرادی کوششوں سے معاشرے میں وہ انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جس کا اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ معاشرے میں تبدیلی منظم اجتماعی تحریک سے لائی جا سکتی ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے: "میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے۔ سمع اور طاعت' جہاد اور ہجرت اور جماعت" (رواہ ترمذی)۔

سمع اور طاعت کا حکم اور اس کا التزام قرآن و حدیث میں مذکور ہے۔ ہجرت اور جہاد ہی وہ راہ ہے جس سے انسان کی شخصیت میں جلا پیدا ہوتی ہے اور وہ ان تمام قربانیوں کے لیے آمادہ ہوتا ہے جو اس راہ کے لیے درکار ہیں۔ جماعت میں رہ کر ہی آدمی اپنی تربیت مکمل کر سکتا ہے۔ روح تنقید کو جماعت میں بیدار رکھنا چاہیے تاکہ اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں رونما ہوں' ان کی اصلاح کی جا سکے۔ تنقید کی اہمیت اور اجتماعی زندگی میں اس کی ضرورت پر مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

تنقید ہی وہ چیز ہے جو ہر خرابی کی بروقت نشان دہی کرتی اور اس کی اصلاح کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادی حیثیت سے صفائی کی اہمیت ہے۔ جس طرح نجاست و طہارت کی حس مٹ جانے اور صفائی کی کوشش بند ہو جانے سے ایک بستی کا سارا ماحول گندا ہو جاتا ہے اور اس کی فضا ہر طرح کے امراض کے لیے سازگار ہو جاتی ہے'

ٹھیک اسی طرح تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہو گی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی (تحریک اور کارکن۔ ص ۱۰۶)

جماعتی زندگی بسر کر کے ہی انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ اختلافات کے باوجود وہ متحد ہو کر کام کرے۔ رائے، مزاج، حکمت عملی ہر چیز میں اختلاف ہونا، انسانی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن انانیت کے بجائے اختلاف کے آداب و حدود کی پابندی کرنے سے انسان سب کے ساتھ چل بھی سکتا ہے اور اپنی بات موثر اور مدلل انداز میں منوا بھی سکتا ہے۔

آفات و حجابات:

جس طرح شاہراہ پر سفر کرنے والوں کے لیے مختلف تنبیہی نشانات محکمہ ٹرانسپورٹ کی طرف سے نصب کیے جاتے ہیں تاکہ ڈرائیور خطرات سے آگاہ رہے اور بحفاظت اپنا سفر طے کر سکے، اسی طرح تزکیہ نفس کی منزل کے مسافروں کے لیے بھی اس راہ کی رکاوٹوں اور آفتوں کی نشان دہی ضروری ہے تاکہ رہروان حق بخیریت اپنی منزل و مقصود تک حوادث راہ سے بچتے ہوئے پہنچ جائیں۔ اصلاً یہ وہ بیماریاں ہیں جو یا تو بیک وقت یا آہستہ آہستہ انسان کو اس کی منزل سے دور کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان سے آگاہی ضروری ہے۔

۱- **غفلت اور بے پروائی :** یہ بڑی عام وبا ہے۔ انسان شوق سے اصلاح نفس کی طرف بڑھتا ہے۔ کچھ حاصل بھی کرتا ہے لیکن وہ نسیان کا پتلا بھی ہے اس لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ کی ہے وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ (غفلت برتنے والوں میں سے نہ ہو)۔ انسان کو جو کچھ بھی حاصل ہو اس کی پوری تن دہی سے نگہداشت کرے، اس کی قدر کرے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تاکہ اسے انعامات سے مزید نوازا جائے۔ بے قدری، لاپروائی اور غفلت سے انسان وہ سب کچھ کھو دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے۔ یہود اور نصاریٰ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صاف تصریح کی ہے کہ انھوں نے کتاب الٰہی کی ناقدری کی اور اس کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ ان میں اختلاف رونما ہوا اور وہ راہ راست سے بھٹک گئے۔ (المائدہ ۵:۱۳-۱۴)

۲- **کبر و غرور :** جب انسان تزکیہ نفس کی طرف متوجہ ہوتا اور اپنے آپ کو برائیوں سے دور رکھتا ہے اور نیکیوں کو اپناتا ہے، تو اپنے معاشرے میں اس کو کچھ نمایاں حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ لوگ بھی اس کی راست بازی، شرافت نفس اور دین داری کی تعریفیں کرتے ہیں۔ تقویٰ اور احسان کے حصول میں اس کی

تگ و دو نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اگر وہ محتاط نہ ہو تو یہیں سے اس میں فخر کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب وہ کامل ہو گیا ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ شیطان کا داؤ ہے جو اسے فریب نفس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شیطان خود اس تکبر میں مبتلا ہو کر راندہ درگاہ باری تعالیٰ ہوا۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ کِبْرٍ، جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں داخل ہو گا۔

اس سے بچنے کے لیے انسان ان لوگوں کی طرف نہ دیکھے جو اس سے علم و عمل میں فروتر ہیں بلکہ ان کی طرف دیکھے جو تقویٰ، علم اور معرفت الٰہی میں اس سے زیادہ بلند مقام پر ہیں۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جو انبیا علیہم السلام اور صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیاں، اسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کی ہیں، انسان جب بھی ان کے اعلیٰ مقام پر نظر رکھے گا تو اپنے آپ کو ہمیشہ فروتر پائے گا اور اس میں کاملیت کی غلط فہمی پیدا نہ ہو گی۔ جونہی انسان نے یہ سمجھا کہ وہ کامل ہو گیا ہے، وہی اس کے زوال کا پہلا زینہ ہے۔ اس لیے ہمیشہ اس جذبے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ ورنہ ہم نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ بھی کھو بیٹھیں گے۔

۳- **کاملیت کی ہوس:** انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے، اس کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ اگرچہ یہ جذبہ قابل قدر ہے لیکن چونکہ انسان خطا کا پتلا ہے، اس لیے اس کا ہر کام صد فی صد معیاری نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ اپنے کسی کام سے مطمئن نہیں ہوتے، انھیں کامل ہونے کی ہوس ہوتی ہے (perfectionist)۔ مگر جب یہ مقام حاصل نہیں ہوتا تو وہ بددل ہو جاتے ہیں اور مایوسی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ حالانکہ نصب العین کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس مقام کے لیے تگ و دو کی جائے جس کا حصول اگرچہ مطلوب ہو لیکن قابل حصول نہ ہو۔ اس لیے جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ اتنا اعلیٰ اور ارفع مقام ہے کہ جہاں تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے۔

۴- **حب عاجلہ:** انسان فطرتاً جلد باز واقع ہوا ہے (خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ) (الانبیاء ۲۱:۳۷)، تزکیہ نفس کا حصول ایک طویل اور مسلسل جدوجہد چاہتا ہے۔ بہت جلد وہ کچھ حاصل نہیں ہوتا جو انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ پھر اس راہ میں مشکلات بھی ہوتی ہیں، ان پر قابو پانے کے لیے صبر اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے صبری اور جلد بازی سے انسان کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمت ہار دینے اور راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے مشکلات و مصائب کا پامردی سے مقابلہ کرنے سے انسان کا اصل جوہر کھلتا ہے۔ یہ مجاہدہ نفس اور استقامت، تزکیہ کے لیے ناگزیر ہے۔ فوراً کامیابی کی طمع سے بلند مقاصد اور اعلیٰ اقدار

حاصل نہیں ہو سکتے۔

۵- **مایوسی :** مایوسی سب سے زیادہ مہلک بیماری ہے۔ یہ تو انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ سورہ یوسف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ؀ (۸۷:۱۲) "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔ اس لیے جب حالات ناسازگار ہوں، کامیابی کے امکانات دور دور تک دکھائی نہ دیتے ہوں، تو انسان پر قنوطیت چھا جاتی ہے۔ وہ مزید مایوسی اور بے چارگی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان کو کسی حال میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، چاہے وہ سو بار بھی ناکام ہو۔ ہر ناکامی کے بعد عزم نو سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹:۶۹) "جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے"۔

۶- **غلو :** انسان میں یہ عام کمزوری ہوتی ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بے اعتدالی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ بعض مسائل میں، عبادات میں اور اخلاق میں وہ ایک انتہاپسندانہ روش اختیار کر لیتا ہے۔ اس پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرتا ہے۔ اسلام انسان کو افراط و تفریط کے بجائے اعتدال کی راہ پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے انسان توازن اور معتدل مزاجی کو برقرار رکھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ دین کے معاملے میں اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا: اِيَّاكُمْ بِالْغُلُوِّ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّيْنِ، خبردار! انتہاپسندی میں نہ پڑنا کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں انتہاپسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے ہیں۔

تزکیہ نفس کے حوالے سے مشکلات، موانع اور آفات کا ذکر ہوا۔ اس سے یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ یہ راہ ہم سے طے ہی نہ ہو گی۔ اس میں سراسر آسانی کے پہلو ہیں۔ اولاً انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے اور برائی سے طبعاً خوش نہیں ہوتا۔ پھر انسان کی تمام زندگی اور کائنات میں ہونے والے ہر واقعے میں تربیت کے پہلو ہیں۔ اس کے لیے وہ کسی تربیتی کورس کا محتاج نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے وہ انسان کے بس میں ہیں اور کسی شخص پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری نہیں ڈالتا ورنہ خلاف انصاف ہوتا۔ محترم خرم مرادؒ نے ان امور پر تفصیل سے اپنی کتاب **اپنی تربیت کیسے کریں؟** میں روشنی ڈالی ہے جس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

یتیم پوتے کی میراث

مولانا گوہر رحمٰن

وفاقی شرعی عدالت میں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ کی دفعہ ۴ کو، جس کی رو سے یتیم پوتے کو میراث میں حق دیا گیا ہے، اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا ہے کہ یہ شریعت سے متصادم ہے۔ مولانا گوہر رحمٰن نے اس موقف کے حق میں عدالت میں جو بیان دیا، اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ کی دفعہ ۴ میں کہا گیا ہے کہ:

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر ہوں) بہ حصہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

وراثت کا یہ وضعی قانون شرعی قانون سے یقیناً متصادم اور متناقض ہے اور یہ تصادم و تناقض روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ مگر دور جدید کے متجددین کا طریقہ کار یہ ہے کہ غیر متعلقہ مباحث چھیڑ کر اور اسلام کے منصوص اور اجماعی احکام کو اجتہادی اور اختلافی مسائل کی شکل دے کر ان احکام کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا جائے۔ یہ طرز فکر اور طریقہ کار تحقیق نہیں بلکہ تلبیس ہے۔ آخر نصوص و اجماع سے متصادم اجتہاد بازی کو بحث و تحقیق اور استدلال کا نام کون دے سکتا ہے اور کیسے دے سکتا ہے؟ لیکن چونکہ ان متجددین اور مستشرقین کا وضع کردہ قانون ملک میں نافذ ہے جسے یہ عدالت ختم کر سکتی ہے، اس لیے میں اپنے دلائل عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، مگر اصل دلائل سے قبل چند مسلمہ اصول پیش کرتا ہوں۔

اصول ثلاثہ

۱۔ اسلام میں قرآن و سنت کو سپریم لا کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے قرآن و سنت کے متن اور نص کے خلاف قانون بنانے یا فیصلہ دینے کا حق کسی مسلمان کو حاصل نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا کفر و شرک اور ظلم و فسق ہے۔

۲۔ یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی بھی قانون کی وہ تعبیر و تشریح قابل اعتبار نہیں ہو سکتی جو اس قانون

کے ماہرین کی متفقہ تعبیر کے خلاف ہو۔ اس لیے قرآن و سنت کے متن اور نص کی وہ تعبیر و تشریح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جو قرآن و سنت کے ماہرین یعنی صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ و مجتہدینؒ کی متفقہ تعبیر کے خلاف ہو۔ ایسا کرنا تجدد ہے، اجتہاد نہیں۔

۳۔ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے اور جدید مسائل کے حل کے لیے علم و تحقیق کے اداروں میں آج بھی اجتہاد ہو رہا ہے، پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ لیکن قرآن و سنت کے متن اور اس کی متفقہ تعبیر کے خلاف اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کا اجتہاد کرنا اللہ و رسولؐ کے احکام کی تنسیخ یا ترمیم کے مترادف ہے جس کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

ان اصول ثلاثہ کی تذکیر کے بعد اب میں پوتے کی میراث کے بارے میں اپنے دلائل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو بنیادی طور پر تین قسم کے ہیں: قرآن کریم، سنت رسولؐ اور اجماع امت۔

قرآن کریم

۱۔ دور جاہلیت کے عربوں کا قانون وراثت یہ تھا کہ جو وارث قبیلے کے لیے لڑ سکتے تھے، میراث انھی کو دی جاتی تھی۔ عورتیں چونکہ لڑ نہیں سکتی تھیں اس لیے وہ میراث سے محروم ہوتی تھیں۔ اسی طرح کم سن بیٹے بھی میراث کے مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے اس لیے کہ وہ بھی لڑائی میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ قرآن کریم نے اس ظالمانہ قانون کو ختم کر کے یہ قانون نافذ کیا کہ جو وارث مورث کے قریب تر ہوں گے وہی میراث کے حق دار ہوں گے "الاقرب فالاقرب"۔ یہ قرآنی اصول درج ذیل آیت میں بیان ہوا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ○ (سورۃ النساء ۴: ۷-۸)

"مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔

اس آیت میں وضاحت و صراحت کے ساتھ یہ اصول بیان ہوا ہے کہ میراث کے استحقاق میں لڑنے کے قابل ہونے یا نہ ہونے کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جائے گا اور فقر و تنگ دستی یا کمزوری اور یتیمی کو بھی معیار نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ مورث کا قریب ترین رشتے دار کون ہے۔ یتیموں اور مسکینوں کی

کفالت اور خبر گیری کے لیے اسلام میں دوسرے احکام موجود ہیں جو ہر لحاظ سے کافی اور مکمل ہیں۔ اگر یتیمی کو بنیاد بنایا جائے تو پھر جو بھی یتیم ہو' اسے میراث ملنی چاہیے خواہ پوتا ہو' بھتیجا ہو یا بھانجا۔ اگر فقر و احتیاج کو معیار بنایا جائے' تو پھر مال دار بیٹوں کی جگہ فقیر و نادار بھائیوں یا بھتیجوں کو میراث دینی چاہیے۔ اور اگر نفس قرابت کو معیار قرار دیا جائے تو پھر ہر انسان دوسرے کا وارث بن سکتا ہے۔ اس لیے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اسلام نے یتیمی' ناداری اور نفس رشتہ داری کی جگہ "الاقرب فالاقرب" کو بنیاد بنایا ہے کہ ذوی الفروض کو مقررہ حصے دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے وہ قریب ترین عصبات کا حق ہے۔ اس لیے کہ تقسیم میراث کی علت یتیموں' بیواؤں اور ناداروں کی مالی امداد اور معاشی کفالت نہیں ہے بلکہ انتقال ملکیت اس کی اصل علت ہے کہ جب کوئی شخص مرجائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی املاک کس کی ملکیت میں دی جائیں؟ کیونکہ جایداد و املاک کو بغیر مالک کے آزاد چھوڑ دینے سے بد نظمی اور بدامنی پیدا ہو سکتی ہے اور ان سے پوری طرح فائدہ بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسلام نے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ مرنے والے کی املاک اس کے قریب ترین رشتے داروں کی ملکیت میں دے دی جائے۔ یہ قرآنی اصول اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں بن سکتے۔

دوسرا اصول اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میراث ترکے میں جاری ہوتی ہے اور ترکہ وہ اموال و املاک ہوتی ہیں جن کو چھوڑ کر ان کا مالک دنیا سے انتقال کر چکا ہو۔ یہ اصول مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ میں لفظ "ترک" سے ثابت ہوتا ہے۔ مورث کی زندگی میں اس کے اموال و املاک نہ بیٹوں کے ہوتے ہیں اور نہ پوتوں کے بلکہ ان کا وہ خود مالک ہوتا ہے۔ لیکن عائلی قوانین کی دفعہ ۴ میں اس قرآنی اصول کو نظرانداز کر کے باپ کو اس کی زندگی ہی میں مورث قرار دے کر اس کے بیٹے اور بیٹی کا حصہ محفوظ کر لیا گیا ہے جو اس کے انتقال پر پوتے یا نواسے کو ملے گا۔ اسی طرح میراث کا بدیہی اور مسلمہ اصول ہے کہ وارث وہی شخص ہو سکتا ہے جو مورث کی موت کے وقت زندہ ہو۔ اس لیے کہ میراث انتقال ملکیت کے لیے تقسیم ہوتی ہے اور مردہ شخص کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ لیکن زیر غور قانون میں مردہ بیٹے اور بیٹی کو زندہ فرض کر کے اپنے باپ کا وارث بنایا گیا ہے اور پھر ان کا حصہ ان کے بیٹوں بیٹیوں کو یعنی مورث کے پوتوں پوتیوں کو دیا گیا ہے۔

سورۃ النساء کی مذکورہ آٹھویں آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے رشتے دار وراثت کے حق دار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ جب تقسیم میراث کے وقت ایسے قرابت دار اور یتامیٰ و مساکین حاضر ہو جائیں تو مشترک ترکے میں سے ان کو جتنا دے سکتے ہو' دے دو۔ اگر ان سے وارث مراد ہوتے تو وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ کی شرط نہ لگائی جاتی۔ اس لیے کہ وارث کا تقسیم میراث کے وقت

حاضر ہونا شرط نہیں ہے بلکہ صرف زندہ ہونا شرط ہے۔ اسی طرح اگر اس آیت میں فَارْزُقُوهُمْ سے وراثت میں ان کا حصہ دینا مقصد ہوتا تو اس میں یتامیٰ اور مساکین کا ذکر نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ ہر یتیم اور ہر مسکین کو تو متجددین بھی وراثت میں حصہ دار بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دراصل اس آیت کا تعلق میراث کے استحقاق سے نہیں ہے بلکہ اس میں ایک نفلی صدقے کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ غیروارث قرابت داروں اور عام یتیموں اور مسکینوں کو تقسیم میراث کے وقت کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔ غیروارثوں کو ترکے میں سے کچھ دینا اگرچہ بعض کے نزدیک واجب ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک یہ حکم استحبابی ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ وجوبی حکم ہوتا تو پھر ہر قسم کے ذوی القربیٰ اور یتامیٰ و مساکین، ذوی الفروض اور عصبات کے ساتھ وراثت میں حصہ دار بن جاتے اور اگر یہ سب حصہ دار ہیں تو پھر ذوی الفروض کے حصے متعین کرنے اور الاقربین کی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی (احکام القرآن لابن العربی اور تفسیر قرطبی، النساء، آیت ۸)۔

بڑے دکھ اور حیرت و تعجب کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عائلی قوانین کے ایک وکیل کمل فاروقی نے اس آیت کو یتیم پوتے کی وراثت کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کیا تھا اور فَارْزُقُوهُمْ کا ترجمہ کیا تھا: "اس میں سے ان کو ان کا حصہ دے دو" (ماہنامہ فکر و نظر، اسلام آباد، مارچ۔اپریل ۱۹۹۵)۔

حالانکہ اس آیت میں پوتے کا ذکر نہیں ہوا بلکہ مطلق یتامیٰ و مساکین کا ذکر ہوا ہے۔ اگر یتامیٰ کے لفظ سے یتیم پوتے کا حق وراثت ثابت ہوتا ہے تو پھر مساکین کے لفظ سے ہر غریب و مسکین کا حق وراثت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ طفلانہ اجتہاد جس کی بنیاد پر یہ لوگ مذکورہ آیتوں سے ثابت شدہ اصولوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

۲۔ مذکورہ آیت میں حصص کے تعین کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا تھا (نَصِيبًا مَّفْرُوضًا) مگر ان حصص کی تفصیلات بیان نہیں ہوئی تھیں۔ یہ تفصیل سورۃ النساء کی آیت ۱۱ اور ۱۲ میں بیان ہوئی ہے جن کا ہمارے زیر بحث مسئلے سے متعلق حصہ یہ ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (سورۃ النساء ۴:۱۱)

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

اولاد کے مفہوم میں بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں اور پڑپوتے پڑپوتیاں سب شامل ہیں اس لیے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں "یابنی آدم" اور "یابنی اسرائیل" کا لفظ ذکر ہوا ہے جس سے پوری نسل انسانی اور نسل اسرائیلی مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انا سید ولد آدم "میں اولاد آدم کا سردار ہوں" یعنی پوری نسل انسانی کا سردار ہوں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اطلاق تو سب پر ہوتا ہے مگر

اس لفظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس کا جواب ابن عربیؒ اور جصاصؒ نے یہ دیا ہے کہ صلبی اولاد پر اس کا اطلاق حقیقتاً ہوتا ہے اور بیٹے کی اولاد پر مجازاً ہوتا ہے۔

> میرے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ لفظ اولاد کا استعمال دور کی اولاد (پوتوں، پڑپوتوں) کے لیے مجاز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پوتے سے ولد ہونے کی نفی کی جاسکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ اگر یہ اس کے حقیقی معنی ہوتے تو اس کی نفی کی گنجایش نہ ہوتی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں ہے کہ پوتے کو تو (مجازا) بیٹا کہا جاتا ہے مگر صلبی بیٹے کو پوتا کوئی بھی نہیں کہتا۔ بہرحال حقیقت ہو یا مجاز اس بات پر امت متفق ہے کہ اس جگہ پر اولاد کا انطباق سب پر ہوتا ہے (احکام القرآن لابن العربی، ج ۱، ص ۳۳۳، طبع بیروت، ۱۹۸۸)۔

> لفظ اولاد کا اطلاق بیٹے کی اولاد (پوتوں) اور صلبی اولاد سب پر ہوتا ہے لیکن صلبی اولاد پر اس کا اطلاق حقیقتاً ہوتا ہے اور بیٹے کی اولاد پر مجازاً ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صلبی اولاد کی موجودگی میں اس سے پوتے مراد نہیں لیے جاسکتے اور نہ پوتے بیٹوں کے ساتھ ان کے حصوں میں شریک ہو سکتے ہیں (احکام القرآن للجصاص، ج ۳، ص ۱۴)۔

حقیقی اور مجازی معنوں کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ "معنی حقیقی" کی نفی نہیں کی جاسکتی اور "معنی مجازی" کی نفی کی جا سکتی ہے۔ ابن عربیؒ نے اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ پوتوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ میرے بیٹے نہیں ہیں لیکن بیٹوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ میرے بیٹے نہیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹوں پر لفظ اولاد کا اطلاق حقیقی معنوں میں ہوتا ہے اور پوتوں پر اس کا اطلاق مجازی معنوں میں ہوتا ہے۔ امام جصاصؒ نے جو یہ کہا ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے مراد نہیں لیے جاسکتے اور نہ پوتے بیٹوں کے ساتھ میراث میں شریک ہو سکتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عربیت کا قاعدہ ہے کہ ایک ہی لفظ سے بیک وقت اور بیک نسبت حقیقی اور مجازی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے اور جب تک "حقیقی معنی" مراد لینا ناممکن نہ ہو، اس وقت تک "مجازی معنی" مراد لینا جائز ہی نہیں ہے۔ عربیت کے اس قاعدے سے مبتدی طالب علم بھی واقف ہیں۔ لہٰذا جب کسی مورث کا بیٹا موجود ہو، جو حقیقی اولاد ہے تو اس وقت اولادکم سے پوتا مراد لینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ حقیقت کی موجودگی میں مجاز کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر بیٹے کے ساتھ پوتے کو وراثت میں حصہ دار بنا کر دونوں مراد لے لیے جائیں تو بیک وقت اور بیک نسبت حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع لازم آتا ہے جو عربی قواعد کے اعتبار سے منع ہے۔ البتہ اگر کسی مورث کے صلبی بیٹے موجود نہ ہوں تو اس صورت میں چونکہ حقیقی معنی مراد لینا ممکن نہیں ہیں کیونکہ حقیقت موجود ہی نہیں ہے، اس لیے لازماً مجازی اولاد کو یعنی پوتے پوتیوں کو میراث منتقل ہو گی۔ امام فخر

الدین رازیؒ متوفی ۶۰۶ھ نے امام جصاصؒ ہی کی بات بڑے اچھے انداز میں تفسیر کبیر میں لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وارث بنانا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایک لفظ سے بیک وقت حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔ لہٰذا صلبی اولاد کی موجودگی کے وقت اولاد سے پوتے مراد نہیں لیے جاسکتے البتہ ان کی غیر موجودگی کے وقت پوتے ہی مراد لیے جائیں گے اور پوتوں کی غیر موجودگی کے وقت پڑپوتے مراد ہوں گے (تفسیر کبیر، ج ۹، ص ۲۰۸)۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لفظ "اولاد" کا استعمال بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں سب کے لیے حقیقی معنوں میں ہوتا ہے یعنی لفظ "اولاد" سے عام مفہوم مراد لے لیا جائے خواہ بلاواسطہ اولاد ہو یا ایک واسطے سے ہو یا دو واسطوں سے ہو یا تین واسطوں سے ہو اور ان سب کو حقیقی اولاد قرار دیا جائے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مورث کی میراث اس کے بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں سب کو دی جائے گی (اگر سب موجود ہیں) یا اس کے لیے کوئی ترجیحی قاعدہ موجود ہے جس کی روشنی میں ترجیحات قائم کی جائیں گی؟ اس سوال کا جواب لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ میں موجود ہے کہ یوصیکم اللہ فی اولادکم سے اولادکم الاقربین مراد ہے۔ یعنی جو قریب تر ہوں، ان کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر بیٹے موجود ہوں تو پوتے حقیقی اولاد کہلانے کے باوجود محروم ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ باواسطہ اولاد ہیں اور بیٹے بلاواسطہ اولاد ہیں۔

اسی طرح اگر بیٹے تو موجود نہ ہوں مگر پوتے موجود ہوں تو پڑپوتے محروم ہوں گے اس لیے کہ یہ دو واسطوں سے مورث کی اولاد ہیں اور پوتے ایک واسطے سے اس کی اولاد ہیں۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنا بہترین اور اولین طریقہ تفسیر ہے۔ اس قاعدے کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم آیت ۷ میں لفظ الاقربون کو آیت ۱۱ میں لفظ اولادکم کی تفسیر قرار دے دیں تو اس بحث کی ضرورت نہیں پڑتی کہ اولاد کے حقیقی معنی کیا ہیں اور مجازی معنی کیا ہیں؟ اس لیے کہ اولادکم کے ساتھ الاقربین کی صفت لگانے سے بیٹوں کی موجودگی میں پوتے اور پوتوں کی موجودگی میں پڑپوتے خود بخود خارج ہو جائیں گے۔

بعض متجددین نے کہا ہے کہ آیت ۷ میں الاقربون مورث کی صفت واقع ہوئی ہے تو اس کو آیت ۱۱ میں اولادکم کی تفسیر کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ بات اتنی زیادہ کچی، سطحی اور طفلانہ ہے کہ اس کا جواب دینا بھی تحصیل حاصل نظر آتا ہے۔ آخر ان لوگوں کو یہ بدیہی حقیقت بھی معلوم نہیں ہے کہ قریب تر ہونا مورث اور وارث کے درمیان ایک نسبت ہے۔ جب مورث وارث کے قریب تر ہو گا تو لازماً وارث بھی اس کے قریب تر ہو گا۔ صلبی اولاد کی موجودگی میں جب دادا اپنے پوتے کے لیے اقرب نہیں ہے تو پوتا بھی

دادا کے لیے اقرب نہیں ہے۔ البتہ پڑپوتے کے مقابلے میں پوتا اور دادا دونوں ایک دوسرے کے اقرب ہیں۔ الاقرب فالاقرب کے اسی قرآنی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عربیؒ لکھتے ہیں:

اولاد کا لفظ اوپر نیچے سب کو شامل ہے۔ پس اگر وہ درجے میں برابر ہوں تو قرآن کی تقسیم کے مطابق اپنا اپنا حصہ لیں گے اور اگر درجے میں تفاوت ہو کہ بعض اوپر ہوں اور بعض نیچے ہوں تو اوپر والے نیچے والوں کو میراث سے محروم کر دیں گے۔ اس لیے کہ اوپر والا کہے گا کہ میں میت کا بیٹا ہوں اور نیچے والا کہے گا کہ میں میت کے بیٹے کا بیٹا ہوں تو جب اس کا درجہ نیچے آگیا تو اس کی دلیل بھی کٹ گئی۔

تمام مفسرین نے اسی طرح لکھا ہے کہ اگرچہ اولادکم کے مفہوم میں اولاد اور اولاد الاولاد سب شامل ہیں لیکن بیٹوں کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ اولادکم سے قریب ترین اولاد مراد ہے اور پوتے بیٹوں کے مقابلے میں بعید ہیں۔ مفسرین کی یہ تفسیر قرآن کے لفظ الاقربین پر مبنی ہے۔

سنت رسولؐ

تفسیر القرآن بالقرآن کے بعد تفسیر کا مستند ذریعہ سنت رسولؐ ہے۔ اللہ نے اپنا رسولؐ بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور احکام کی وضاحت کرے۔ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرہ ۲:۱۲۹)، "ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے"۔ اور لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل ۱۶:۴۴) "تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے"۔ سنت رسولؐ کو نظرانداز کر کے قرآن کو سمجھنا مشکل ہے۔ مثلاً اسی زیربحث آیت 'یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَوْلَادِکُمْ کو لیجیے' اس میں لفظ "اولاد" کا ذکر بغیر کسی قید و شرط کے ہوا ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر، لیکن اللہ کے مقرر کردہ معلم قرآن نے وضاحت فرمائی ہے کہ:

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (بخاری و مسلم، کتاب الفرائض، عن اسامہ بن زیدؓ)۔

مسلمان کافر سے میراث نہیں لے سکتا اور کافر مسلمان سے میراث نہیں لے سکتا۔

اسی طرح لفظ اولاد کے عموم و اطلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیٹے نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہو تو پھر بھی وہ اس کی وراثت لے سکتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ: اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ "قاتل اپنے مقتول کی میراث نہیں لے سکتا" (ترمذی، ابن ماجہ، کتاب الفرائض)۔

اسی طرح اس آیت میں لفظ "اولاد" کے ساتھ قریب یا بعید کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ اگر حدیث کو مدنظر نہ رکھا جائے اور سورۃ النساء کی چھٹی آیت میں لفظ اَلْاَقْرَبُوْنَ سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں تو

پوتا اور پڑپوتا دادا کی میراث میں اپنے باپ کی زندگی میں بھی حصہ دار قرار دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اولاد کے مفہوم میں پوتے اور پڑپوتے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سورۃ النساء کی آیت ۱۱ اور ۱۲ میں ذوی الفروض کے حصے تو متعین کر دیے گئے ہیں مگر یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ ان کے حصوں سے جو مال بچ جائے وہ کون لے گا؟ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات میراث کی تشریح کرتے ہوئے جو ضابطہ بیان فرمایا ہے وہ بڑا جامع و مانع ہے:

اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ

مقررہ حصے ان کے مستحقین تک پہنچا دو اور جو بچ جائے وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔

امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب الفرائض کے چار ابواب میں چار اسانید کے ساتھ نقل کی ہے۔ باب میراث الولد من ابیه وامه، باب میراث ابن الابن اذ الم یکن ابن، باب میراث الجد مع الاب والاخوۃ اور باب ابنی عم احدھما اخ لام والآخر زوج اور مسلم شریف نے کتاب الفرائض کے اوائل میں یہ حدیث تین سندوں کے ساتھ نقل کی ہے۔ بخاری و مسلم دونوں نے جس حدیث کو نقل کیا ہو، اس کو اصطلاحاً "متفق علیہ" حدیث کہا جاتا ہے جو صحیح احادیث میں سنداً سب سے اقویٰ اور اصح حدیث سمجھی جاتی ہے۔

صحیحین کے علاوہ یہ حدیث سنن ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، سنن دارقطنی، مسند ابوحنیفہ اور مسند احمد میں بھی نقل ہوئی ہے۔ اس حدیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ ذوی الفروض کو ان کے حصے دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے وہ عصبات میں الاقرب فالاقرب کے اصول پر تقسیم ہو گا یعنی بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو حصہ نہیں ملے گا اور صلبی بیٹوں کی غیر موجودگی میں پوتے وارث ہوں گے۔ مگر حدیث کے الفاظ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضابطہ ذوی الفروض کے لیے نہیں ہے بلکہ ان سے بچے ہوئے مال میں عصبات کے لیے ہے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر زید بن ثابتؓ نے فرمایا ہے کہ:

> جب صلبی اولاد نہ ہو تو بیٹوں کی اولاد ان کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ لڑکے لڑکوں کی طرح ہوں گے اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح ہوں گی۔ وہ اسی طرح میراث لیں گے جس طرح کہ بیٹے لیتے ہیں اور اسی طرح نچلے طبقے کو محروم کریں گے جس طرح کہ بیٹے نچلے طبقے کو محروم کرتے ہیں اور پوتا بیٹے کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتا (صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن)۔

صحابہؓ میں سے زید بن ثابتؓ میراث کے احکام کو سب سے زیادہ جانتے تھے جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وَاَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ (سنن ترمذی، کتاب المناقب)۔ صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ کے اس فتوے کی مخالفت کسی سے منقول نہیں ہے۔

علامہ بدر الدین عینیؒ فرماتے ہیں کہ:

وھذا الذی قاله اجماع (عمدۃ القاری شرح بخاری، ج ۲۳، ص ۲۳۸)

زید بن ثابتؓ نے جو کچھ کہا ہے اس پر اجماع ہے۔

امام جصاصؒ فرماتے ہیں:

وھذا قول اھل العلم جمیعاً من الصحابة والتابعین (احکام القرآن للجصاص، ج ۳، ص ۱۵)۔

یہ تمام اہل علم صحابہ و تابعین کا قول ہے۔

اجماع امت

قرآن و سنت کے مذکورہ دلائل کی بنا پر امت مسلمہ کے تمام فقہا کا اجماع ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو میراث نہیں دی جا سکتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ آپؐ کی پوری امت باطل اور ضلالت پر متفق نہیں ہو سکتی۔ قرون ثلاثہ یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں یہ مسئلہ اتفاقی رہا ہے اور یہ اتفاق آج تک تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ دور جدید میں بھی چند متجددین کے علاوہ اہل سنت اور اہل تشیع سب کے سب اس مسئلے پر متفق ہیں۔

امام مالکؒ متوفی ۱۷۹ھ لکھتے ہیں:

یہ متفق علیہ حکم ہے جس پر ہم نے اپنے شہر کے اہل علم کو مجتمع پایا ہے کہ بیٹوں کی اولاد کو وہی حیثیت حاصل ہے جو اولاد کو حاصل ہے جبکہ صلبی اولاد موجود نہ ہو۔ لڑکے لڑکوں کی طرح ہوں گے اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح ہوں گی۔ پوتے اسی طرح میراث لیں گے جس طرح کہ بیٹے لیتے ہیں اور نچلے طبقے کو اسی طرح محروم کریں گے جس طرح کہ بیٹے محروم کرتے ہیں۔ پس اگر صلبی اولاد اور بیٹے کی اولاد جمع ہو جائے اور صلبی اولاد میں بیٹا موجود ہو تو اس کے ساتھ بیٹے کی اولاد میں کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا (الموطا امام مالکؒ، کتاب الفرائض، باب میراث الصلب)۔

علامہ ابو الولید باجیؒ متوفی ۴۹۴ھ موطا کی شرح میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح امام مالکؒ نے کہا ہے کہ پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں میراث نہیں مل سکتی اس لیے کہ بیٹا پوتے کے مقابلے میں میت کے زیادہ قریب ہے (المنتقیٰ، ج ۶، ص ۲۲۶)۔

فقہ ظاہریہ کے امام ابن حزمؒ ظاہری متوفی ۴۵۶ھ نے بھی اس کو اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے:

پوتے بیٹے کی موجودگی میں کچھ بھی نہیں لے سکتے خواہ بیٹا ان کا "باپ" ہو یا چچا ہو۔ اور بھتیجے بھائی کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتے خواہ سگا بھائی ہو یا صرف باپ کی طرف سے ہو۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ذوی الفروض سے جو بچ جائے وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے

اور یہ یقینی اجماع ہے (المحلی لابن حزم' ج ۹' ص ۲۷۱)۔

ابن رشد قرطبیؒ متوفی ۵۹۵ھ نے بھی اس بارے میں اجماع نقل کیا ہے:

اہل علم نے اس بارے میں اجماع کر لیا ہے کہ پوتے بیٹوں کے قائم مقام اسی وقت ہو سکتے ہیں جبکہ بیٹے موجود نہ ہوں (بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد' ج ۲' ص ۳۴۰' طبع مصر' ۱۹۶۰)۔

امام قرطبیؒ متوفی ۶۷۱ھ نے بھی اس کو اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے:

اگر صلبی اولاد میں بیٹا موجود ہو تو پوتے کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے (تفسیر قرطبی' ج ۵' ص ۳۲)۔

امام نوویؒ متوفی ۶۷۶ھ ' مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں نے اس پر اجماع کر لیا ہے کہ مقررہ حصوں سے جو بچ جائے وہ عصبات کے لیے ہے۔ اس طرح کہ اقرب فالاقرب کو ترجیح دی جائے گی۔ اس لیے دور کا عصبہ (مثلاً پوتا) قریب کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتا (شرح مسلم "کتاب الفرائض' ج ۱۱' ص ۵۳' طبع قاہرہ' ۱۹۸۷)۔

شیعہ حضرات کے بہت بڑے فقیہ ابن بابویہ قمیؒ متوفی ۳۸۱ھ لکھتے ہیں:

پوتا اور نواسی "صلبی اولاد" کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتے اور نہ پوتے کا بیٹا پوتے کی موجودگی میں میراث لے سکتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس کا نسب قریب ہو وہ دور کے رشتے دار سے میراث کا زیادہ مستحق ہے (من لایحضرہ الفقیہ' ج ۴' ص ۱۹۶' طبع تہران)۔

ابو جعفر کلینیؒ متوفی ۳۲۸ھ نے "فروع کافی" میں اور ابو جعفر طوسیؒ متوفی ۴۶۰ھ نے "الاستبصار" میں بھی لکھا ہے کہ اولاد اسی وقت میراث لے سکتی ہے جبکہ صلبی اولاد موجود نہ ہو (فروع کافی' ج ۷' ص ۸۸' طبع تہران' الاستبصار' ج ۴' ص ۱۶۷)۔

شبہات کا ازالہ:

گزشتہ صفحات میں مثبت طور پر عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کا قرآن و سنت اور اجماع امت سے متصادم اور متناقض ہونا ثابت کر دیا گیا ہے لیکن بحث و تحقیق کا تقاضا ہے کہ مخالف رائے کے دلائل پر بھی علمی انداز میں غور کیا جائے اور اگر دلائل کی قوت سے ثابت ہو جائے کہ یہ رائے قوی ہے تو اس کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ حق پسندی' حق جوئی اور حق گوئی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن جب بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وراثت میں حصہ دلانے والوں کے دلائل کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ دلیل نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ البتہ کچھ شبہات ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ متجددین اور آزاد خیال مجتہدین ان کو دلیل کا نام دے کر الجھنیں پیدا کر رہے ہیں۔

پہلا شبہ: عائلی قوانین کے حامیوں کی پہلی دلیل یہ ہے کہ یوصیکم فی اولادکم میں لفظ "اولاد" کے مفہوم میں پوتے بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ان کو بھی میراث میں حصہ دینا ضروری ہے۔ اس کا جواب قرآن و سنت اور اجماع امت سے دیا جا چکا ہے کہ اس جگہ قریب ترین اولاد مراد ہے۔ اگر یہ لوگ مطلق اولاد مراد لیتے ہیں تو پھر پوتے کے لیے اپنے باپ کی موجودگی میں بھی وراثت میں حصہ مقرر کر دیں۔ حالانکہ اس کی گنجایش تو ان کے اجتہاد میں بھی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ باپ کی زندگی میں پوتا وارث اس لیے نہیں بن سکتا کہ اس کا باپ اپنا حصہ خود لیتا ہے لیکن اس کے فوت ہو جانے کے بعد پوتا دادا کے ترکے سے اپنے باپ کا حصہ وصول کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ باپ تو مر چکا تھا اور مردے کو میراث دی ہی نہیں جا سکتی تو پوتا اپنے باپ کے کون سے حصے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہاں! اگر وہ پوتا ہونے کی حیثیت سے باپ کا حصہ نہیں بلکہ اپنا حصہ لیتا ہے تو پھر اپنے باپ کی زندگی میں بھی اسے یہ حصہ ملنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پوتا ہونے کی حیثیت پر باپ کے زندہ ہونے یا مر جانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پوتا پوتا ہی ہوتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا ذہنی الجھاؤ ہے جس میں یہ لوگ خود بھی مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا شبہ: عائلی قوانین کے ایک وکیل مولوی عمر احمد عثمانی کا ایک مضمون ماہنامہ فکر و نظر ' اسلام آباد' شمارہ دسمبر ۱۹۶۵ میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے قائم مقامی کے یورپین فلسفے کو دلیل قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ تقلید یورپ ہے۔ اس مضمون میں مولوی عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

> وراثت کا سارا دارومدار دراصل "قائم مقامی" کے اصول پر ہے۔ جس یتیم بچے کا باپ مر گیا ہو وہ وراثت میں اپنے باپ کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور جس بچے کا باپ ہو وہ اپنے باپ کے زندہ ہونے کی وجہ سے وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دادا اور پوتے کے درمیان باپ کا واسطہ موجود ہے جو اسے محجوب کر دیتا ہے۔ ہمارے فقہا کرام نے نہ معلوم کیوں اس بنیادی اصول یعنی "قائم مقامی" کو ملحوظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے وہ اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے یتیم پوتے کو محجوب و محروم قرار دے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہا کرام غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ یہ مضمون نویس کج فہمی کی وجہ سے یورپ کی تقلید میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ میراث کے بارے میں یورپی اقوام کا قانون یہ ہے کہ مرنے والا شخص زندہ ہونے کی صورت میں اپنے مورث سے جو حصہ پاتا ہے، وہی حصہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد پائے گی (المبادی الشرعیہ للعلامہ محمصانی)۔ جبکہ اسلام کا قانون میراث یہ ہے کہ وراثت زندہ شخص ہی

کو ملتی ہے۔ جب ایک شخص اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا اور اس نے وراثت میں اپنا حصہ لیا ہی نہیں تھا تو اس میں اس کی اولاد قائم مقام کس چیز میں بنے گی اور کیسے بنے گی؟ فقہا کرام نے "قائم مقامی" کے لیے الاقرب فالاقرب کے اصول کو ملحوظ رکھا جبکہ عائلی قانون کے وکیلوں نے زندہ شخص کو مورث اور مردہ شخص کو وارث بنا کر "قائم مقامی" کا یورپی اصول اپنایا ہے۔ اس پر یہی کہا جا سکتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تیسرا شبہ: معترضین کی جانب سے ایک اور غیر متعلق جذباتی بات کو بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ چونکہ اسلام نے یتیموں کی پرورش اور نگہداشت پر بہت زیادہ زور دیا ہے لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ یتیم پوتوں کو اپنے دادا کے ترکے میں حصہ دیا جائے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک غلط مبحث ہے جس کے ذریعے یہ متجددین قرآن و سنت کی نصوص اور اجماع امت سے ثابت شدہ حکم کو مشکوک بنانا چاہتے ہیں۔ گذشتہ سطور میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ تقسیم میراث کی علت یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری اور پرورش نہیں ہے بلکہ انتقال ملکیت ہے اور اسلام نے یہ اصول بتایا ہے کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے، وہ الاقرب فالاقرب کے اصول کے مطابق عصبات میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس اصول کی روشنی میں بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو دادا کی ملکیت منتقل نہیں ہو سکتی۔ باقی رہی یتیم پوتوں کی خبر گیری اور معاشی کفالت تو اگر ان کے باپ نے کوئی جایداد نہ چھوڑی ہو تو ان کی کفالت دادا کے ذمے واجب ہے اور دادا کی غیر موجودگی میں دوسرے عصبات پر الاقرب فالاقرب کے اصول پر لازم ہے۔

اسلام میں نفقۃ الاقارب کا قانون موجود ہے۔ جس کی تفصیل اس وقت موضوع سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ دادا اپنی زندگی میں پوتوں کو اپنی جایداد کا کچھ حصہ ہبہ بھی کر سکتا ہے مگر ہبہ کردہ جایداد کی ملکیت اس وقت تک منتقل نہیں ہو سکتی جب تک کہ پوتوں کو یا ان کے ولی کو قبضہ نہ دیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دادا اپنے کل املاک کے ایک تہائی حصے تک پوتوں کے لیے وصیت کر کے کسی دیانت دار شخص کو وصیت کے نفاذ کے لیے اپنا وصی بنا لے۔ وصی بیٹا بھی ہو سکتا ہے، بھائی بھی ہو سکتا ہے، اور کوئی اجنبی بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں بعض اوقات پوتوں اور پوتیوں کو بیٹوں اور بیٹیوں سے زیادہ حصہ مل جائے گا۔ اسلام کے بتائے ہوئے ان طریقوں کو نظرانداز کر کے "یتیم پوتے پر رحم" کے نام سے قرآن و سنت اور اجماع امت سے ثابت شدہ حکم بدلنا اجتہاد نہیں ہے بلکہ تحریف ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہ۔ رحم و شفقت کا مستحق صرف پوتا ہی نہیں ہے بلکہ یتیم بھتیجا، یتیم بھانجا اور غیر رشتے دار یتیم بھی رحم و شفقت کے مستحق ہیں۔ مگر اس اصول کے تحت بیٹے کی موجودگی میں، میراث میں انھیں حصہ کیوں نہیں دیا

جاتا؟

چوتھا شبہ: عائلی قوانین کے حامیوں نے ایک اور شک و شبہ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے جو یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کا جو قاعدہ فقہا نے بنایا ہے وہ کوئی باقاعدہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ اس کے ٹوٹنے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص ایک بیٹی اور ایک پوتا چھوڑ کر فوت ہو جاتا ہے تو اس کے ترکے کا نصف بیٹی کو ملے گا اور نصف پوتے کو دیا جائے گا یا مثلاً یہ کہ ایک شخص نے اپنے وارثوں میں دو بیٹیاں' ایک پوتا اور ایک پوتی چھوڑی ہو تو اس صورت میں دو تہائی دو بیٹیوں کو دیا جائے گا اور باقی ایک تہائی پوتا اور پوتی آپس میں اس طرح تقسیم کریں گے کہ پوتے کا حصہ پوتی سے دگنا ہو گا۔

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ فقہا نے نہیں بنایا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور جس ارشاد رسولؐ میں یہ قاعدہ بیان ہوا ہے اس کے متن میں یہ وضاحت موجود ہے کہ یہ قاعدہ عصبات کے لیے ہے' ذوی الفروض کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے کہ ذوی الفروض بھی متعین ہیں اور ان کے حصے بھی متعین ہیں۔ ان میں الاقرب فالاقرب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مذکورہ مثالوں میں ایک بیٹی یا دو بیٹیاں ذوی الفروض ہونے کی حیثیت سے اپنا مقررہ حصہ لینے ہی کی حق دار ہیں اور ان سے جو بچ جائے وہ پوتا اکیلے یا پوتا پوتی دونوں مل کر بطور عصبہ لیں گے اس لیے کہ بیٹے کی غیر موجودگی میں یہ قریب تر ہیں۔ البتہ پوتے پوتی کی موجودگی میں پڑپوتے اور پڑپوتی کو کچھ بھی نہیں مل سکتا اس لیے کہ وہ اقرب نہیں ہیں۔ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ تب ٹوٹتا کہ کوئی ایسی مثال موجود ہوتی جس میں قریب تر عصبہ کے ہوتے ہوئے بعید کو وراثت میں حصہ دیا گیا ہوتا۔ لیکن ایسی کوئی مثال ہمارے علم میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ شبہ یا تو میراث کے احکام و قواعد سے ناواقفیت پر مبنی ہے یا پھر دانستہ طور پر کج بحثی کے ذریعے شرعی حکم کو مشتبہ و مشکوک بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دونوں صورتیں بڑی افسوس ناک ہیں۔

پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں وراثت میں حصہ دار بنانے کا اسلام کے احکام کے ساتھ تصادم تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کی دو مزید مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) اس دفعہ کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی جب اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہو جائے تو اس کی اولاد کو اپنے نانا کے ترکے میں وہی حصہ ملے گا جو بیٹی کو اس کے زندہ ہونے کی صورت میں ملتا' حالانکہ بیٹی کی اولاد ذوی الارحام میں شامل ہے اور ذوی الارحام اگرچہ حنفیہ" مالکیہ" اور حنابلہ" کے نزدیک میراث لے سکتے ہیں مگر ذوی الفروض اور عصبات کی موجودگی میں محروم رہتے ہیں۔ لیکن عائلی قوانین کی زیر غور دفعہ عصبات کی موجودگی میں بھی نواسے اور نواسیوں کو وارث بناتی ہے جو شرعی حکم کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص ایک "بیٹی" ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑ کر فوت ہوا ہو تو اس صورت میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بخاری و مسلم میں یہ نقل ہوا ہے کہ بیٹی کے لیے نصف حصہ ہے، پوتی کے لیے چھٹا حصہ ہے' تاکہ دو تہائی پورے ہو جائیں۔ اور باقی ایک تہائی (عصبہ مع الغیر ہونے کی وجہ سے) بہن کو ملے گا (بخاری 'کتاب الفرائض' باب میراث ابنة ابن مع ابنیة)۔ لیکن عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کی رو سے بیٹی کو ایک تہائی ملے گا اور پوتی کو دو تہائی حصہ ملے گا۔ اس لیے کہ یہ اپنے باپ کا حصہ لیتی ہے اور اس کے باپ کا حصہ تو ظاہر ہے کہ دوگنا ہے باقی رہی بہن تو وہ اس دفعہ کی رو سے محروم رہے گی۔ یہ ہے ان متجددین کا اجتہاد کہ صلبی بیٹی کو ایک تہائی دیا جا رہا ہے اور پوتی کو "قائم مقامی" کے یورپی اصول کے تحت دو تہائی سے نوازا جا رہا ہے اور بہن کو عصبہ مع الغیر ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ ؏

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!!

میں معزز شرعی عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کا خلاف اسلام ہونا واضح اور قطعی دلائل سے ثابت کر دیا گیا ہے' اس لیے اس کے خلاف اسلام ہونے کا فیصلہ صادر فرما دیا جائے۔

اخبار امت

طالبان اور افغانستان

عبد الغفار عزیز

مزار شریف' تالقان اور سمنگان سمیت متعدد اہم علاقوں کا طالبان کے ہاتھ میں آنا افغانستان میں اہم پیش رفت ہے۔ اب افغانستان کا تقریباً نوے فی صد علاقہ طالبان کے پاس ہے۔ کمانڈر احمد شاہ مسعود اور حزب وحدت کے کچھ علاقے ہی اب ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ان علاقوں میں بھی (تادم تحریر) متعدد محاذوں پر لڑائی ہو رہی ہے اور گمان غالب ہے کہ یہاں فی الحال مزاحمت کا نسبتاً طویل دور ہو گا۔ اس گمان کی متعدد خارجی و داخلی وجوہات ہیں جن میں خارجی وجوہات زیادہ اہم ہیں۔

ان تازہ کامیابیوں کے بعد "طالبان تحریک" کے حوصلے بہت بلند ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال ان کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ کر رہی ہے۔ اب تک طالبان کی ساری توجہ اپنے علاقے میں امن و امان قائم کرنے پر مرکوز تھی۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے افغان عوام کو غیر مسلح کرنے کی کامیاب پالیسی اختیار کی۔ لیکن تازہ "فتوحات" اور تقریباً اڑھائی برس کے اقتدار کے بعد اب وقت کے تقاضے اور بھی ہیں: کھنڈرات کو دوبارہ ایک جیتے جاگتے ملک میں بدلنا' بھوک' افلاس' جہالت اور بیماریوں کو کم کرنا' طالبان کے بعض اقدامات کے خلاف مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے کا مداوا کرنا' چند ایسے اہم' فوری اور عظیم چیلنج ہیں جن کا طالبان کو سامنا ہے۔

طالبان کی حالیہ کامیابیوں کا ایک فوری مثبت پہلو یہ ہے کہ افغانستان کو تقسیم کرنے کی اس سازش کا خاتمہ ہو گیا جس کی پخت وپز مختلف عالمی قوتیں کر رہی تھیں۔ اب یہ امید قدرے روشن ہے کہ افغانستان متحد و مستحکم ہو گا لیکن اس امید کو حقیقت میں بدلنے کے لیے طالبان کو بہت حکمت اور وسعت قلبی سے کام لینا ہو گا۔ افغانستان لاتعداد لسانی و قومی و قبائلی گروہوں کا ملک ہے۔ ان تمام عناصر کو مقام احترام دیے بغیر' ان میں احساس شرکت و مشاورت پیدا کیے بغیر اور ان کی قیادت سے مفاہمت پیدا کیے بغیر افغانستان کے شکستہ پیالے کو ایک مضبوط ہاتھ میں محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ افغانستان پر سرخ فوجوں کی یلغار کے بعد جس افغان

قیادت نے سالہا سال تک مزاحمت کی قربانیاں دی، اندرون و بیرون ملک احترام و محبت کا مقام حاصل کیا، باہمی جھگڑوں نے اسے بہت مجروح کیا ہے، لیکن اب بھی امت اسلامیہ ان کی قربانیاں فراموش نہیں کر سکتی۔ امت مسلمہ نہیں بھول سکتی کہ اسی قیادت نے روسی ریچھ کو گرم پانیوں تک پہنچنے اور پوری دنیا پر اپنے نظریے کو مسلط کرنے سے روکا ہے۔ طالبان کا فرض ہے کہ ذاتی اختلافات اور عالمی سازشوں کا شکار ہو جانے والے افغان رہنماؤں سے گفت و شنید کریں اور انھیں اعتماد میں لے کر اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے ذریعے افغان عوام کی ذہنی و فکری تربیت کا کار عظیم انجام دیں۔

اس مرحلے میں خود قائدین افغان جہاد کو بھی اپنے اوراق نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ آج سے تقریباً تین برس پیشتر جو کردار وہ ادا کر سکتے تھے اب نہیں کر سکتے۔ ان بدلتے حالات میں انھیں از سرنو جائزہ لینا ہو گا کہ افغانستان میں ایک شاندار اسلامی حکومت قائم کرنے کا ان کا خواب کس طرح اپنی تعبیر پا سکتا ہے۔ انھیں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے فیصلہ کرنا ہو گا کہ اگر طالبان کے ہاتھوں افغانستان متحد اور مکمل طور پر امن ہونے کی امید ہے تو طالبان سے اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود ان کے ساتھ تعاون کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

یہ مختصر ذکر تو تھا افغانستان کے متعلق امت کی امیدوں اور خواہشات کا، لیکن آیئے دیکھیں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ مزار شریف اور دیگر شہروں پر طالبان کے قبضے کے بعد شمال اور شمال مغرب میں واقع پڑوسی ممالک کی طرف سے شدید ردعمل ظاہر ہوا ہے۔ مزار شریف میں گیارہ ایرانی سفارت کاروں کی افسوس ناک گمشدگی نے طالبان، پاکستان اور ایران میں سخت کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ روس نے تقریباً پچیس ہزار فوجی افغان سرحدوں کے قریب متحرک کر دیے ہیں، ازبکستان اور تاجکستان نے اپنی فوجیں چوکنا کر دی ہیں اور دوستم اور اس کے حلیف مزار شریف کی بازیابی کے لیے کوشاں ہیں۔ اس پوری صورت حال میں سب سے سنگین مسئلہ ایران کی پاکستان سے ناراضگی کا ہے۔ ایران کو یقین ہے کہ طالبان کا کلی انحصار پاکستان پر ہے اور پاکستان ان کے سفارت کاروں کی رہائی کے لیے مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ ایران کا موقف یہ ہے کہ طالبان کی اصل باگ ڈور پاکستان کے ہاتھ میں ہے اس لیے سفارت کاروں کی رہائی کا مطالبہ طالبان سے نہیں پاکستان ہی سے کرنا چاہیے۔ تہران میں پاکستانی سفارت خانے کے باہر مسلسل مظاہرے اسی موقف کا اعلان ہیں۔

اس لیے اس مسئلے کو فوری اور حکیمانہ انداز سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے وزیر خارجہ ملک میں معاشی بحران پیدا کرنے کے بعد اب خارجہ پالیسی میں بھی متضاد بیانات دے رہے ہیں۔ اس مسئلے میں ان کا پہلا بیان آیا "پاکستان ایرانی سفارت کاروں کو رہا کروائے گا"۔ اب کہہ رہے ہیں کہ "یہ طالبان اور ایران کا مسئلہ ہے"۔ اس طرح کے بے سوچے سمجھے بیانات پڑوسیوں سے پاکستان کے تعلقات کے لیے زہر قاتل

ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان کو ایران سمیت پوری مسلم دنیا کی مکمل و گرم جوش تائید کی ضرورت ہے۔

افغانستان میں امن و استحکام کی امید کے ساتھ ہی ساتھ کچھ نئے خدشات بھی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ ان خدشات میں سرفہرست خدشہ بلکہ خطرہ یہ ہے کہ کچھ عناصر جو اب تک پوری طرح طالبان کے ساتھ تھے اب اس فکر میں ہیں کہ طالبان کو ایک عبوری حل ہی سمجھا جائے۔ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی ادارے اس ضمن میں طویل عرصے سے وسیع البنیاد حکومت کا فارمولا پیش کر رہے ہیں۔ اس فارمولے کی بنیادی کڑی افغان حکومت میں ظاہر شاہ یا اس قبیل کے عناصر کو شامل کرنا ہے۔ نجیب انتظامیہ کے خاتمے کے بعد ربانی، حکمت یار اتحاد کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے میں بھی مرکزی کردار اسی فارمولے اور اس کے ہاتھوں کا تھا اور اب طالبان سے "چھٹکارا" پانے کے لیے بھی مرکزی کردار انھی کو دینے کی فکر مندی ہے۔

ہمارے انگریزی پریس اور وزارت خارجہ کے اشاروں کنایوں میں اس "ضرورت" کا اظہار شروع ہو گیا ہے کہ کوئی نیا "سیٹ اپ" سامنے آئے۔

عالم اسلام اور ماسکو کی پالیسی

محمد ظہیر الدین بھٹی

یہ دلچسپ مضمون ایک روسی اخبار "نیزاویسمایا گازیٹا" میں شائع ہوا۔ اس میں روسی نقطہ نظر کی نمایندگی کرتے ہوئے، مضمون نگار نے روسی حکومت کے سامنے مسلمانوں کے بارے میں چند حقائق رکھے ہیں اور تجاویز پیش کی ہیں۔ اس مضمون کا عربی ترجمہ ہفت روزہ "المجتمع" (۱۹ مئی ۹۸) میں شائع ہوا۔ اس کے اہم نکات، قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ (مدیر)

روس، سابق سوویت یونین کا وارث ہے جو اقتصادی بدحالی کے نتیجے میں، اب اقوام عالم میں، اقتصادی لحاظ سے ۵۵ ویں نمبر پر ہے۔ سابق سوویت یونین کے ممالک کے سوا، اس کا دنیا میں کوئی مخلص حلیف نہیں۔ مغرب اور بالخصوص امریکہ روس کو طاقتور نہیں دیکھنا چاہتا۔ ادھر چین اپنے آپ کو مضبوط کر رہا ہے۔ وہ کئی روسی علاقوں پر اپنا حق سمجھتا ہے۔ روس کے جنوب میں ترکی ہے جو امریکہ کا حلیف ہے۔ وہ قفقاز اور وسط ایشیا میں خصوصی کردار ادا کرنے کا متمنی ہے۔

افغانستان پر حملے سے پہلے، عالم اسلام روس کے بارے میں قدرے نرم گوشہ رکھتا تھا مگر افغانستان میں فوجی مداخلت اور تاجکستان اور چیچنیا کے بارے میں روسی رویے کی وجہ سے عالم اسلام روس سے مایوس ہو چکا ہے۔ اسے ناقابل اعتماد تصور کیا جاتا ہے اور اسلام کا دشمن نمبر ایک سمجھا جاتا ہے۔

اسلام اپنے پیروکاروں کی تعداد کے لحاظ سے پوری دنیا کا دوسرا بڑا مذہب ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب کے قریب ہے۔ چودہ ممالک میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے جب کہ ۴۰ سے زیادہ ممالک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں ہیں۔ مسلم ممالک زبردست اقتصادی وسائل و امکانات سے مالا مال ہیں۔ بین الاقوامی سیاسی میدان میں اسلام کا کردار اساسی ہے۔

کچھ لوگ اسلام پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں' روسی صحافت بھی اس تہمت طرازی میں برابر کی شریک ہے۔ عصر حاضر میں مسلمانوں کی شدت پسند تنظیمیں درحقیقت عالم اسلام پر مغربی ممالک کی چیرہ دستیوں کا ردعمل ہیں۔ ابتدا میں یہ انتہا پسند تنظیمیں صرف مغرب کے خلاف تھیں۔ پھر ساٹھ اور ستر کے عشرے میں امریکہ کی پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بن کر اٹھیں۔ یہ روس کی مخالفت میں بھی سرگرم رہیں۔ مسلم انتہا پسند اقلیت میں ہیں' مسلمانوں کی غالب اکثریت نہایت پرامن ہے۔

"اسلامی مملکت" کے قیام کی کوششوں کو انتہا پسندی سے تعبیر کرنا ایک غلط فہمی ہے۔ "اسلامی مملکت" سے مراد ہے' دینی اور سیکولر امور کو' اسلام کے دیے گئے اصولوں کے مطابق چلانا۔ اسلامی ملک میں اقتدار اعلیٰ کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔ اس میں عادلانہ نظام شریعت اعتدال کے ساتھ چلایا جاتا ہے۔ "اسلامی ریاست" ایک عصری اقتصادی و سیاسی نقطہ نظر ہے جس میں ہر دور اور ملک کی ترقی کی خصوصیات جھلکتی ہیں۔

روس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۲ کروڑ ہے۔ روس کا مستقبل ان مسلمانوں کے ساتھ مناسب طرز عمل پر منحصر ہے۔ یورپی اور ایشیائی ملک ہونے کی بنا پر روس کو ایسا موقف اپنانا چاہیے جو مشرق و مغرب دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔

روس کے برعکس' امریکی طرز عمل مسلمانوں کے قریب تر ہے۔ امریکہ نے ایسی پالیسی اختیار کی ہے کہ مسلم ممالک اس کے طرف دار ہیں' مثلاً امریکہ کے خلیجی ممالک کے ساتھ مضبوط تعلقات' بوسنیا کے بارے میں موزوں پالیسی' مشرق وسطیٰ کے بحران کو کم کرنے کی امریکی کوشش وغیرہ۔ مسلم ممالک میں سے عراق' ایران اور لیبیا کے ماسوا سب کے ساتھ امریکہ کے تعلقات دوستانہ ہیں۔ البتہ مسلم اور غیر مسلم ممالک میں قائم کئی مسلم تنظیمیں امریکہ سے سخت نفرت کرتی ہیں۔

ان حالات میں روس کا فرض ہے کہ وہ داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر اپنے رویے میں اصلاح کرے۔ تاجکستان اور چیچنیا میں امن و استحکام کے لیے فعال پالیسی اپنائے۔ خارجہ پالیسی میں مضبوط اقتصادی تعاون کے لیے کوشش کرے۔ خلیج کے ممالک' پاکستان' ایران' شام' مصر' عراق اور لیبیا کے ساتھ اسلحہ فراہم کرنے میں تعاون کرے۔ عراق اور لیبیا کو عالمی حصار سے نکالنے کے لیے جلد از جلد اقدام کرے۔ امیر

مسلم ممالک کی مالیات سے استفادے کے لیے ایک مناسب حکمت عملی وضع کرے۔ اس سلسلے میں روس میں بسنے والے مسلم رہنماؤں اور بیرونی اسلامی ذرائع کا تعاون حاصل کرے اور اسلامی ممالک کے ساتھ تعاون کرے۔ عام مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد کرے۔

اب وقت آگیا ہے کہ روس، دسمبر ۱۹۷۹ میں افغانستان میں فوج کشی کی غلطی کو تسلیم کرے۔ فکر سلیم کے حامل روسی سیاست دانوں کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ ان کا یہ اقدام سابق سوویت یونین کے شہریوں اور افغان عوام، دونوں کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوا۔ اس اقدام سے اس غریب مسلم ملک کو وہ نقصان پہنچا جس کی اس ملک کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

داخلہ پالیسی کے لیے تجویز کردہ اقدامات :

روس کو اس حقیقت کا برملا اظہار و اعتراف کرلینا چاہیے کہ روس آرتھوڈکس عیسائی مسلم ملک ہے۔ اس لیے کہ اس کے باشندوں کی اکثریت عیسائی اور مسلمان ہے۔ ان دونوں مذہبوں کے پیروکاروں میں جس قدر تعلقات مضبوط ہوں گے، اتنا ہی ملک کو استحکام حاصل ہو گا۔ روسی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ بیرونی مداخلت کاروں سے اجتناب کریں اور اپنے ہی ملک کے مسلم بھائیوں سے تعلقات مضبوط کریں۔ آرتھوڈکس عیسائی اور مسلمان بھی مشترکہ طور پر کام کریں۔ اس مقصد کے لیے مشترکہ اخباری بیانات کا اجرا، مختلف ملاقاتوں اور کانفرنسوں کا انعقاد، قریبی پڑوسی ممالک یا چیچنیا سے آنے والے پناہ گزینوں کی مشترکہ عملی امداد وغیرہ جیسے ضروری کام بجالانے ہوں گے۔ روسی مسلم قیادت کا فرض ہے کہ وہ چیچنیا اور تاجکستان جیسے قریبی مسلم ممالک کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے سرگرم ہو جائیں۔

آیندہ صدارتی یا پارلیمانی انتخابات کے پیش نظر، ہر روسی سیاست دان کو سمجھ لینا چاہیے کہ روس کے مسلمان، کسی ایسی سیاسی پارٹی کو ہی ووٹ دیں گے جس کا اقتصادی و سماجی منشور لاکھوں مسلم رائے دہندگان کو مطمئن کر سکے گا۔

یوکراین کے مسلمان

محمد احمد زبیری

۵ کروڑ سے زیادہ آبادی پر مشتمل یوکراین مشرقی یورپ میں واقع ایک سوویت جمہوریہ ہے۔ اس کے شمال میں ریشین فیڈریشن، بیلارس ہیں، مغرب میں پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور مولڈیفا ہیں جبکہ مشرقی سرحد بھی روس سے ملتی ہے۔ جنوب میں بحراسود اور بحر قزوین ہیں۔ یوکراین کا رقبہ ۶ لاکھ ۳ ہزار ۷ سو مربع کلومیٹر ہے۔ دارالحکومت کییف ہے جو سیاسی و ثقافتی مرکز بھی ہے۔

۲۴ اگست ۱۹۹۱ کے اعلان آزادی کے بعد یوکراین ایک خود مختار ریاست کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ روسی تسلط سے نجات کے بعد مذہبی آزادی دی گئی۔ عیسائیت کے بعد اسلام دوسرا بڑا مذہب اور مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی ۲۰ لاکھ کے قریب ہے۔ مسلم آبادی کا صحیح اندازہ لگانا اس لیے بھی ممکن نہیں کہ ان ممالک میں مردم شماری مذہبی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ یوکراین کے مسلمان مختلف قومیتوں مثلاً تاری، آذری، تاجک، ازبک اور شیشانی پر مشتمل ہیں۔ ان میں قرم کے تاتاریوں کی تعداد ساڑھے تین لاکھ سے چار لاکھ کے درمیان ہے۔ مسلمان زیادہ تر قرم، کییف، خارکوف، دونسک، اڈیسیا، زاپادوے اور دنیپر پتروسک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آزادی کے بعد یوکراین کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو منظم و متحد کیا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف مسلمانوں کو مذہبی آزادی دی گئی ہے بلکہ کیمونسٹ دور کے غصب کردہ مدارس اور مساجد بھی واگزار کر دی گئی ہیں۔ ۱۹۹۵ میں پہلا اسلامی مرکز قرم کے دارالحکومت سمفروپل میں قائم کیا گیا۔ حکومتی سطح پر سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کی آزادی کے بعد یوکراین کے مسلمانوں نے "حزب اسلامی یوکراین" کے پلیٹ فارم سے مارچ ۱۹۹۸ میں پہلی مرتبہ انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ گو اس انتخاب میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بہت سے مسلمانوں کو ووٹ ڈالنے کے حق سے مختلف حربے استعمال کر کے محروم رکھا گیا۔ قرم جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مسلم امیدواروں کی کامیابی کے روشن امکانات تھے، ایک منصوبے کے تحت شناختی کارڈ سے محروم رکھ کر حق رائے دہی کے استعمال سے محروم کر دیا گیا۔ مگر ان انتخابات میں حصہ لینا مسلمانوں کا اپنے سیاسی وجود کو تسلیم کروانے کی سمت ایک ٹھوس اقدام ہے۔ ذرائع ابلاغ اور دیگر اہم شعبوں میں مسلمانوں کا وجود برائے نام ہے۔

یوکراین میں اسلام دسویں صدی عیسوی کے ابتدا میں مسلم تاجروں کے ذریعے متعارف ہوا جو دارالحکومت کییف میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ان میں ترک اور عرب تاجر اور فوبی اور قفقاز کے مسلمان نمایاں تھے۔ اعلیٰ اخلاق اور لسانی و علاقائی تعصب سے پاک محبت نے مقامی لوگوں کو متاثر کیا اور وہ مسلمان ہوئے۔ اشاعت اسلام کا ایک موقع وہ تھا جب یوکراین کے بادشاہ ولادیمیر کینیاز نے اسلام میں دلچسپی لی، مگر اسلام کے بارے میں سطحی معلومات، لوگوں کا شراب نوشی ترک کرنی اور دیگر اخلاقی حدود کے قبول کرنے میں پس و پیش اور پڑوسی ریاست میزنند سے اچھے تعلقات کی خاطر اس نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ ۱۲۴۰ میں منگول تاتاریوں کے ہاتھوں کییف تباہی سے دوچار ہو گیا۔ منگول تاتاریوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ تاتاری ۱۳۱۳ سے ۱۳۴۲ کے دوران مسلمان ہوئے۔ ۱۲۶۷ میں قرم قبیلے کے سردار برکت خان کے قبول اسلام سے یوکراین میں اشاعت اسلام میں اہم پیش رفت ہوئی۔

اس نے فوجی اور جزیرہ نما قرم پر مشتمل علاقوں میں پہلی مرتبہ اسلامی حکومت قائم کی۔ قرم سلطنت ترکیہ کا ایک مدت تک حصہ بھی رہا جس کے نتیجے میں مساجد' مدارس' لائبریریوں کی علاوہ بہت سے اسلامی مراکز قائم ہوئے جو اشاعت اسلام کا اہم ذریعہ بنے۔

جون ۱۷۷۴ میں روسی زار شاہی کے قبضے کے نتیجے میں مساجد' مدارس اور اسلامی مراکز منہدم کر دیے گئے۔ مسلم اوقاف ختم کر دیا گیا' مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور جبراً عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان حالات میں ہزاروں مسلمان ترکی کی طرف ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ اس دوران ۹ سو کے قریب مساجد شہید کر دی گئیں۔ مسلمانوں کی عددی قوت کو غیر موثر کرنے کے لیے انھیں روس کے مختلف علاقوں میں جبراً منتشر کر دیا گیا۔ ان حالات میں بھی مسلمان نماز' تلاوت قرآن اور دینی تعلیمات سے روشناس ہونے کا اہتمام کرتے رہے۔ انیسویں صدی کے نصف میں کچھ مذہبی آزادی کے نتیجے میں لوگانسک اور کیو کامیں دو مساجد تعمیر کی گئیں اور قرم میں ایک اسلامی مرکز قائم کیا گیا۔ ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے نتیجے میں مسلمانوں کو ایک بار پھر اسی قسم کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ دیگر پابندیوں کے علاوہ عربی رسم الخط بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۸۵ میں گورباچوف کے دور میں کچھ مذہبی آزادی بھی ملی۔ مساجد اور مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ مگر عملاً ۱۹۹۱ میں یوکراین کے اعلان آزادی کے بعد مسلمان از سر نو منظم ہونا شروع ہوئے۔ ۱۹۹۱ میں سیمفروپل میں پہلا اسلامی مرکز رجسٹر ہوا۔

اس وقت سیمفروپل کا مرکز یوکراین میں اشاعت اسلام میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس مرکز کے ذریعے ازبکستان' قازقستان اور دیگر ممالک سے واپس آنے والی تاتاریوں کی بحالی اور انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا کام بہت تیزی سے جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۹۵ تک قرم میں ایک سو بیس سے زائد مسلم رفاہی تنظیمیں رجسٹر ہو چکی ہیں جو مسلمانوں کی بحالی اور امداد کے علاوہ انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا کام بھی کر رہی ہیں۔ "حزب اسلامی یوکراین" کے سربراہ رشید ابراہیم نے یوکراین کے مسلمانوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہا کہ اسلام کا تعارف' اسلامی تہذیب و تمدن کا احیا اور نئی نسل کی اسلامی خطوط پر اٹھان کے علاوہ سیاسی سطح پر مسائل کا ہمیں سامنا ہے۔ یہ ایک عظیم اور کٹھن کام ہے مگر ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ اس فریضہ سے کماحقہ عہدہ برا ہو سکیں۔ عالم اسلام' عرب ممالک اور اسلامی تحریکوں کی فکری رہنمائی اور تعاون کی ہمیں ضرورت ہے (المجتمع' کویت' ۳۰ جون ۹۸)۔

اس وقت یوکراین میں عرب اور اسلامی ممالک سے حصول تعلیمی غرض سے آنے والے طلبہ علم جن میں بیشتر کا تعلق تحریک اسلامی' اخوان المسلمون اور حماس سے ہے' اسلام کی اشاعت میں بڑا اہم حصہ لے

کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان نوجوانوں نے "امل" نام سے تنظیم قائم کر رکھی ہے جس کی شاخیں مختلف شہروں میں کام کر رہی ہیں۔ یہ طالب علم ویک اینڈ پر مختلف مقامات پر ہفتہ وار درس کے حلقے قائم کر کے باہمی ملاقاتوں اور تقسیم لٹریچر کے ذریعے اسلام کا پیغام عام کر رہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر کانفرنسوں کے انعقاد اور ڈسکشن فورم کے ذریعے بھی لوگوں کے سوالات کا جواب دیا جاتا ہے اور اسلام کی حقانیت ان پر اجاگر کی جاتی ہے۔ خواتین میں اسے خواتین ونگ کے ذریعے دعوت کا کام کیا جارہا ہے۔ عرب نوجوانوں کی بیویاں اور تاتاری مسلم خواتین اس کام میں تعاون کر رہی ہیں۔ بچوں کا ونگ قائم کر کے نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کی طرف بھی توجہ دی جارہی ہے۔

یوکراین میں عیسائی مشنری بہت سرگرم ہیں۔ ان کا خصوصی ہدف بیرون ممالک سے آنے والے مسلمان طلبہ ہیں جو کہ اسلام کے لیے درد رکھتے ہیں اور اس کے فروغ کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں۔ عیسائیت پر مبنی لٹریچر اردو اور ہندی زبان میں بھی فراہم کیا جارہا ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے لوگوں کو عیسائی بنایا جا سکے۔ انھیں دیگر مراعات کی ترغیب اور لالچ بھی دیا جاتا ہے۔ اس سے عیسائی مشنری کی مستعدی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ مسلم طلبہ کو یہ شکوہ ہے کہ ان کے پاس قرآن مجید کا مکمل ترجمہ بھی نہیں ہے۔ سید مودودیؒ اور تحریک اسلامی کا لٹریچر روسی زبان میں کسی حد تک دستیاب ہے مگر لٹریچر کی کمی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ عالمی اسلامی تحریکوں کو مسلم اقلیتوں کے مسائل کو خصوصی اہمیت دینی چاہیے۔ ترجمہ قرآن، لٹریچر کی فراہمی، مساجد، مدارس اور اسلامی مراکز کا قیام اور مقامی زبان میں مہارت رکھنے والے علما کی تیاری اور فراہمی جیسے اہم مسائل کے حل کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کرنے چاہییں تاکہ مسلم اقلیتوں کے ذریعے اسلام کا پیغام ٹھوس بنیادوں پر عام کیا جا سکے اور انھیں اپنے قریب تر کیا جا سکے۔

(ماخوذ: المجتمع کویت، ۱۹ مئی ۹۸)

رسائل و مسائل

تقرب الٰہی اور ذکر الٰہی

سوال: "خانقاہ کو مرکز ہدایت بنایئے" (مئی ۹۸) کے عنوان کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں تقرب الی اللہ کا انحصار (محض) اللہ کے ذکر پر نہیں بلکہ اس کا اصل ذریعہ اقامت دین کی اس جدوجہد پر ہے جو مولانا مودودیؒ نے شروع کی اور جو فریضہ وقت ہے۔ اس میں جو باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں وہ یہ ہیں:

۱۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا ذکر پہلے تو ذریعہ تقرب تھا لیکن اب نہیں رہا؟

۲۔ یہ فریضہ وقت کیا ہوتا ہے جس پر اب تقرب الی اللہ کا انحصار ہے؟ اس فریضے کا تعین اور تحدید کون کرتا ہے؟ کیا یہ فریضہ ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳۔ اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ اقامت دین وہ فریضہ وقت ہے جس کا تعین اور ابتدا مولانا مودودیؒ نے کی ہے۔ اس سے ذہن میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں، مثلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ چودہ صدیوں تک صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ اور دیگر اسلاف ایسی بنیادی بات سے بے خبر رہے ہوں جو مولانا مودودیؒ کے نزدیک تقرب الی اللہ کا اصل ذریعہ ہے؟ اور اگر مولانا مودودیؒ کی رائے اجتہاد پر مبنی ہے تو جماعت اسلامی کے چند ہزار ارکان کے علاوہ کیا کروڑوں مسلمانان عالم جو مولانا مودودیؒ کی اس رائے سے واقف یا متفق نہیں ہیں تو کیا وہ سب تقرب الی اللہ سے محروم متصور ہوں گے؟

جواب: میری بات کو آپ غلط سمجھے ہیں۔ میں نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ پہلے زمانے میں ذکر الٰہی، قرب الٰہی کا ذریعہ تھا اور اب نہیں رہا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جب ایک آدمی فرائض کا تارک ہو تو مستحبات کو ادا کرنے سے قرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت اللہ کی شریعت معطل ہے، اس کو قائم کرنا مسلمانوں کی اولین ذمہ داری اور فریضہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شریعت قائم فرمادی تھی اور وہ اس وقت تک قائم رہی جب تک خلافت قائم رہی۔ جب خلافت ختم ہو گئی تو شریعت کا نظام بھی انگریزوں اور کفار کے ہاتھوں معطل ہو گیا۔ دور غلامی میں شریعت معطل رہی۔ جب آزادی حاصل ہوئی تو چاہیے تھا

کہ شریعت کا نظام بحال کر دیا جاتا لیکن افسوس ہے کہ وعدوں اور نعروں کے باوجود شریعت کا نظام ابھی تک بحال نہیں ہوا۔ شریعت کو بحال کرانا تمام علما کا متفقہ نظریہ ہے۔ یہ ہر مسلمان کا اولین فرض اور اس کے مسلمان ہونے کا تقاضا ہے۔ یہ شعور بیدار ہو تو شریعت پامال نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں ہر طرح کی قربانیاں بھی آئیں گی جس طرح خود اللہ کے رسولؐ اور ان کے ساتھیوں نے پیش کیں۔ مولانا مودودی رحمتہ اللہ کے نزدیک اقامت دین کا یہی مفہوم ہے، لیکن یہ تنہا مولانا مودودیؒ کا نظریہ نہیں بلکہ تمام علما کے نزدیک یہ دین کا ایک بنیادی فریضہ ہے۔ اگر ایک آدمی ایک طرف زبانی ذکر اذکار کرتا ہے لیکن نفاذ شریعت سے غیر متعلق ہے، اس میں وہ اہل حق سے تعاون نہیں کرتا تو پھر اس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت نہیں پا سکتا۔ حضرت حسن بصریؒ آیت فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ..... کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **فاذکرونی فیما افترضت علیکم اذکرکم فیما اوجبت لکم علٰی نفسی**، مجھے ان فرائض کے ذریعے یاد کرو جو میں نے تم پر عائد کیے ہیں تو میں تمھیں ان اعزازات اور ثوابوں کے ذریعے یاد کروں گا جو میں نے اپنے اوپر تمھارے لیے لازم کیے ہیں۔ سعید بن جبیرؒ مشہور تابعی فرماتے ہیں: **اذکرونی بطاعتی اذکرکم بمغفرتی** (تفسیر ابن کثیر، آیت نمبر ۱۵۲)، یعنی تم مجھے میری اطاعت کے ذریعے یاد کرو میں تمھیں اپنی مغفرت کے ذریعے یاد کروں گا۔

آپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا مختصر جواب یہ ہے:

مولانا مودودیؒ نے اقامت دین کے فریضے کو اپنے دور میں شروع کیا ہے۔ مولانا مودودی کی تحریک اقامت دین کے تذکرے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے یہ کام کسی نے نہیں کیا، یہ کام تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ آپؐ کے بعد صحابہ کرام نے دنیا میں دین کو غالب کیا۔ اس وقت دنیا میں ساٹھ کے قریب مسلمان ریاستیں ہیں۔ پہلے یہ سب ایک حکومت کی شکل میں تھیں۔ دور زوال میں مسلمانوں نے اس ایک ریاست کو ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا اور اکثر ریاستوں میں شریعت کو بھی معطل کر دیا۔ لہٰذا اب ضروری ہے کہ ان تمام ریاستوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ تسلیم کی جائے اور ان میں شریعت بھی جاری کی جائے۔ اس کے لیے جدوجہد کرنا فریضہ وقت ہے۔ فریضہ وقت سے مراد یہ ہے کہ نماز کے وقت نماز پڑھی جائے، رمضان المبارک کا مہینہ آئے تو روزے رکھے جائیں۔ حج کا موقع آئے تو حج کیا جائے اور جہاد کا وقت آئے تو جہاد کیا جائے۔ جہاد کی وجہ سے بعض اوقات نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔ جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر اور بعض روایتوں میں آتا ہے ظہر، عصر، مغرب، عشاء قضا ہو گئی تھیں جو کہ عشاء کے وقت آپؐ نے ادا کیں۔

نفاذ شریعت کو میں نے جو وقت کا فرض کہا ہے وہ اس معنی میں ہے کہ تمام مسلمانوں کو اولین توجہ نفاذ

شریعت کی طرف دینی چاہیے۔ دوسری چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کرلیں۔ فرائض کا تعین تو اللہ تعالیٰ نے خود کر دیا ہے اور ان کے اوقات بھی اس نے متعین کر دیے ہیں۔ جب دین قائم ہو تو اسے قائم رکھنا فریضہ وقت ہے اور جب قائم نہ ہو تو پھر اسے قائم کرنا فریضہ وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو دین نازل فرمایا ہے وہ قائم کرنے کے لیے نازل فرمایا ہے، اس میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بھی شامل ہیں اور نکاح و طلاق وراثت اور تجارت، اجارہ، عدالت اور سیاست سب شامل ہیں۔ قرآن پاک میں ان سب کا ذکر ہے۔ ان کو قائم کرنا اور ان کے مطابق معاشرے کو استوار کرنا اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ جب تک ہم اس دین کو قائم نہیں کریں گے اس وقت تک اس کو قائم کرنے کا بوجھ ہماری گردنوں پر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو قائم اور غالب کرنے کی سعادت سے نوازے۔ (م - ع - م)

مشرک کے پیچھے نماز

س: ایک آدمی اللہ کی مدد بھی مانگتا ہے، رسولؐ سے بھی مانگتا ہے، اور صحابہؓ اور بزرگوں سے بھی مانگتا ہے۔ کیا یہ شرک نہیں ہے؟ اگر شرک ہے تو کیا ایسے آدمی کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

ج: جب تک کسی کے مزعومہ مشرکانہ اقوال و اعمال کی بنا پر اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ مسلمان ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ ہمارے معاشرے میں غیراللہ سے مدد مانگنا، بزرگوں کو مشکلات میں پکارنا تاویلاً ہوتا ہے۔ اس لیے تاویل اور جہالت کی بنا پر مشرک ہونے کا حکم نہیں لگا دیا جاتا بلکہ ایسے اقوال پر تنقید کر کے لوگوں کو اس سے احسن انداز سے روکا جاتا ہے اور اصلاح کی جاتی ہے۔ آپ اجتماعیت کو برقرار رکھنے اور لوگوں کی اصلاح کی خاطر، فتووں کا طریقہ نہ اختیار کریں بلکہ واعظ اور مبلغ اور داعی حق کی حیثیت سے ایسے انداز سے نشتر لگائیں کہ مریض کا آپریشن بھی ہو جائے اور وہ تکلیف بھی محسوس نہ کرے۔

ہمارے معاشرے میں تمام علما کا یہی موقف ہے کہ ایسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھی جائے گی جو تاویلاً غیراللہ کو اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں کیونکہ انھیں ان کی اس قسم کی پکاروں کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا: الصلوٰۃ احسن ما یعمل الناس فاذا احسن الناس فاحسن معہم واذا اساؤا فاجتنب اساءتہم، نماز ان تمام کاموں سے اچھا کام ہے جو لوگ کرتے ہیں۔ اسی لیے جب لوگ اچھا کام کریں تو اچھائی میں ان کے ساتھ ہو جاؤ اور جب برا کام کریں تو ان کی برائی میں ان کا ساتھ دینے سے اجتناب کرو۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: صل وعلیہ بدعتہ، اس کے پیچھے نماز پڑھو اس کی بدعت کا نقصان اس کو ہوگا۔ (بخاری، باب امامۃ المفتون والمبتدع، ج ۱، ص ۹۶)۔ واللہ اعلم! (م - ع - م)

پردے میں غلو

س: ہمارے گاؤں میں گلی کے دونوں طرف ہمارے گھر ہیں اور خواتین کو آمدورفت کے لیے دکانوں کے سامنے سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔ دکانوں میں عموماً لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک رائے یہ دی گئی ہے کہ اگر آنے جانے والوں کو کوئی زحمت نہ ہو تو گلی کے اوپر پل سا تعمیر کر لو تاکہ خواتین پردے میں جا سکیں۔ گزارش ہے کہ اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں بتائیں۔ کیا میں ایسا پل تعمیر کروا دوں؟

ج: جہاں تک خواتین کے لیے گلی میں پل بنانے کا تعلق ہے تاکہ خواتین کا پردہ نہ ٹوٹے تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی خواہش حضرت عمرؓ نے کی تھی کہ عورتیں پردے میں بھی نظر نہ آئیں' لیکن ان کی اس خواہش کو پورا نہ کیا گیا اور ازواج مطہرات اور دوسری خواتین اسلام کو اپنے ضروری کاموں کے لیے باپردہ نکلنے کی اجازت مل گئی' اس کے باوجود کہ ان کے باپردہ جسم پر لوگوں کی نظریں پڑیں۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے حضرت سودہؓ سے فرمایا: قَدْ اُذِنَ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ (بخاری شریف)۔ "تمھیں اجازت دے دی گئی ہے کہ تم اپنے ضروری کام کے لیے نکلو"۔ اس لیے آپ کی یہ تجویز ایک طرح کا غلو ہے اور شریعت اس غلو کی قائل نہیں ہے۔ اس لیے آپ خواتین کو صرف یہ تلقین کریں کہ وہ جب گلی میں نکلیں تو اچھی طرح پردہ کر کے نکلیں اور اسی وقت نکلیں جب انھیں نکلنے کی فی الواقع کوئی ضرورت ہو' بلاوجہ آمدورفت سے پرہیز کریں۔ (م - ع - م)

زکوٰۃ کے بعض مسائل

س: میں خود غریب آدمی ہوں۔ میرے تین بچے ہیں جو بالغ ہیں۔ میری والدہ نے مجھے دس تولے سونا دیا تھا۔ جو میں نے اپنے تینوں بچوں کی شادی کے سلسلے میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ دونوں لڑکوں کو تین تین تولہ اور چھوٹی بیٹی کو چار تولے دے دیا ہے۔ دونوں لڑکے کام وغیرہ کرتے ہیں۔ چھوٹی بیٹی میرے ساتھ ہے۔ اب ان پر سال پورا ہو جائے تو زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے گی؟ اس سونے کے ساتھ چاندی وغیرہ نہیں ہے۔ اگر سال کے بعد میرے بچوں کے پاس ضروریات زندگی کا خرچ نکال کر کچھ پیسے بچ جائیں تو زکوٰۃ ہر ایک کو علیحدہ دینی پڑے گی یا دس تولے سونے کی جو تینوں بچوں کو الگ الگ کر کے دے دیا گیا ہے (جو ان کی شادی کے لیے رکھا گیا ہے) ان کی ایک ساتھ زکوٰۃ نکالنی پڑے گی؟ قرض کی ایسی رقم جو کسی کو دی گئی اور واپسی کا

معلوم نہیں ہے کب دیں گے' اس رقم کی زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے گی؟ بچوں کی شادی کے سلسلے میں اگر کچھ رقم جمع کی جائے تو کیا ایسی جمع شدہ رقم پر بھی سال پورا ہونے پر زکوٰۃ نکالی جائے گی؟ مکان بنانے یا کاروبار کرنے کے سلسلے میں یا مکان کو لیز کرانے کے سلسلے میں جو رقم جمع کی جائے تو کیا سال پورا ہونے پر اس پر بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی؟

ج: زکوٰۃ اس آدمی پر آتی ہے جس کے پاس نقد' سونا' چاندی اور دیگر سامان جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو سارا مل کر مقدار نصاب کو پہنچ جائے۔ اگر آپ کی بیٹیوں کے پاس سونے کی مذکورہ مقدار کے علاوہ کوئی اور نقد روپیہ' ان کی اصل ضروریات (جن میں سامان خورد و نوش' گھریلو سازوسامان' شادی کے لیے خریدا جانے والا سازوسامان' لباس وغیرہ سب شامل ہیں) سے زائد' اتنی مقدار میں ہو کہ سونے کی قیمت اور نقد روپیہ دونوں مل کر مقدار نصاب کو پہنچ جائیں تو پھر ان پر زکوٰۃ ہو گی ورنہ نہیں۔ اسی طرح آپ پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ شادی کے سامان کے لیے جو رقم اکٹھی کی ہے اس پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ زکوٰۃ اسی مال پر عائد ہوتی ہے جو بنیادی ضروریات' خوراک' لباس' مکان' گھریلو سازوسامان وغیرہ سے زائد ہو۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر آپ اپنے بارے میں فیصلہ کرلیں کہ آپ پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے کہ نہیں۔ اسی طرح بیٹیوں کے بارے میں اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرلیں۔ اگر انسان کے پاس رہائش کے لیے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کا مکان ہو اور اس کی گزراوقات بھی بہ آسانی ہو رہی ہو' کوئی تنگی نہ ہو تو پھر مکان بنانے کے لیے جو رقم جمع کی ہو اور جو سال بھر محفوظ پڑی رہی ہو' اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کر دینا بہتر ہے۔ کاروبار کے لیے جمع رقم پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

پیغام قرآن سیریز

خرم مرادؒ آپ کے دل پر دستک دیتے ہیں اور آپ کے رب کا پیغام آپ تک پہنچاتے ہیں۔

1- **قرآن کا پیغام** : امت مسلمہ کے لیے عروج و سربلندی کا ایک ہی راستہ ہے: رجوع الی اللہ اور اس کے لیے قرآن سے تعلق ناگزیر ہے۔

قرآن کا پیغام : آؤ قرآن کی طرف! ہدیہ فی عدد: 3/50 فی سیکڑہ : 250/

2- **عہد وفا اور وفائے عہد** : ایمان لا کر اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے' اسے وفا کرنے کے کیا تقاضے ہیں؟

ہدیہ فی عدد : 4/50 فی سیکڑہ : -/300

3- **تربیت کی پہلی منزل** : سورۃ المزمل کے درس کے حوالے سے' اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف آج کے لوگوں کے لیے کام کی باتیں

ہدیہ فی عدد -/6 فی سیکڑہ : -/400

4- **دعوت کے نشان راہ** : سورہ والضحیٰ کے درس کے حوالے سے رسول اللہؐ آنے والے مراحل دعوت کا بیان اور آج امت مسلمہ کے لیے راہ نمائی

ہدیہ فی عدد : 4/50 فی سیکڑہ : -/300

اس کے علاوہ

☆ قرب الٰہی	ہدیہ فی عدد : 3/50	فی سیکڑہ : 250/
☆ ذکر الٰہی	ہدیہ فی عدد : 4/50	فی سیکڑہ : -/300
☆ چند تصویریں سیرت کے البم سے	ہدیہ فی عدد :-/9	فی سیکڑہ -/600
☆ کلام نبویؐ کی صحبت میں	ہدیہ فی عدد :-/9	فی سیکڑہ -/600
☆ اپنی تربیت کیسے کریں؟	ہدیہ فی عدد -7/50	فی سیکڑہ: -/500

زیادہ تعداد میں طلب کیجیے اور پھیلائیے اور اجر حاصل کیجیے

۱- **منشورات** : منصورہ' ملتان روڈ' لاہور ۵۴۵۷۰ فون : ۵۴۲۵۳۵۶

۲- **ڈیسنٹ بک پوائنٹ** : اے-۵۷' بلاک ۵' گلشن اقبال' کراچی فون : ۴۹۶۷۶۶۱

۳- **بک ٹریڈرز** : بلاک ۱۹' نصر چیمبرز' مرکز ایف سیون' اسلام آباد فون : ۹۲۳۰۹۴

کتاب نما

تفہیم الاحادیث، جلد چہارم۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ جمع و ترتیب اور تخریج: عبدالوکیل علوی۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۵۱۸۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

تفہیم الاحادیث کے پہلے تین حصوں پر انھی صفحات میں تبصرہ آچکا ہے۔ (دیکھیے ترجمان القرآن، مئی ۹۸)۔ اب اس کا چوتھا حصہ شائع ہوا ہے۔ ذخیرۂ حدیث نبویؐ پر فاضل مرتب عبدالوکیل علوی صاحب گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تمام تصانیف، بطور خاص "تفہیم القرآن" کا بہ نظر غائر مطالعہ کر کے، مولانا مرحوم کے ہاں مذکور و منقول جملہ احادیث جمع کیں، بعض جزوی متون کو مکمل کیا اور ان کے اردو ترجمے بھی کیے۔ احادیث کی تلاش، بعض متون کی تکمیل اور ان کے ترجمے کے ساتھ ساتھ فاضل مرتب نے ان کی اسناد بھی تلاش کیں، اور محدثین کی آرا کی روشنی میں ہر حدیث کا مرتبہ اور مقام بھی متعین کیا۔

زیر نظر حصہ روزہ اور حج سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے۔ مرتب نے ہر موضوع پر احادیث کی اتنی تفصیل مہیا کی ہے کہ صرف روزے کے متعلقات (ماہ صیام کی فضیلت، رویت ہلال، سحر و افطار، روزے کے عمومی مسائل، مسافر کا روزہ، روزوں کی قضا، نفلی روزے، رمضان میں قیام لیل، لیلۃ القدر، اعتکاف) کا بیان ساڑھے تین سو صفحات پر پھیل گیا ہے۔ اسی طرح حج سے متعلق امور (فریضہ حج کی اہمیت، مناسک حج، قربانی کے احکام، خطبہ حجۃ الوداع، حج اور عمرہ کی دعائیں) کا ذکر ڈیڑھ سو سے زائد صفحات پر محیط ہے۔ ان موضوعات پر یہ، آپؐ کی ہدایات اور فرمودات کا نہایت مفید مجموعہ ہے، جسے مرتب نے بڑی تحقیق اور محنت سے ترتیب دیا ہے اور ہر حدیث کے ساتھ اس کی صحت و سند سے متعلق وضاحت بھی موجود ہے۔ امید ہے کہ سابقہ تین حصوں کی طرح اس حصے کو بھی قارئین، استفادہ و رہنمائی کے لیے سودمند اور معاون پائیں گے۔ دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ مزید چار جلدیں زیر ترتیب و تدوین ہیں جو معاشیات، سیاسیات، نظم جماعت، معاشرت، اخلاقیات و آداب اور ادعیہ ماثورہ پر مشتمل ہوں گی۔ خدا کرے یہ سب جلد شائع ہوں۔ (رفیع الدین ہاشمی)

جماعت اسلامی کا جائزہ، مولانا عامر عثمانی۔ مرتبہ: سید علی مطہر نقوی امروہوی۔ ناشر: مکتبہ الحجاز پاکستان، اے ۲۲۹ سی بلاک ۲، شمالی ناظم آباد، کراچی۔ صفحات: ۳۴۶۔ قیمت: درج نہیں۔

مولانا مودودیؒ کو اپنی دعوت کے جواب میں اول روز ہی سے بہت سے حلقوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جس نے بعض اوقات، اندھی دشمنی اور تعصب کی وجہ سے سب و شتم کی شکل اختیار کرلی۔

مولانا مودودیؒ نے اپنے رفقا سے بار بار فرمایا: کہ "اس سب و شتم کا جواب دینے کے لیے، میرے (مولانا مودودی) کے علاوہ کوئی بھی مکلف نہیں" تاہم دینی حمیت، علمی دیانت اور شہادت حق کا فرض ادا کرتے ہوئے، جن افراد نے مولانا اور جماعت اسلامی کا دفاع کیا، ان میں مولانا عامر عثمانی (م: ۱۹۷۴ء) کا نام ناقابل فراموش ہے۔ دیوبند میں رہتے ہوئے، دیوبند کے ایک حصے سے الزامات و اتہامات کا مقابلہ وہ تن تنہا اپنے ایمان، قلم اور دماغ کے ساتھ کرتے رہے۔ قرآن، تفسیر، فقہ، تاریخ اور حدیث کے عظیم الشان ذخیرے سے مدد لیتے ہوئے انھوں نے ہر قسم کی یاوہ گوئی کا دندان شکن جواب دیا۔

عامر عثمانی مرحوم صرف دینی علوم ہی کے عالم اور رمز شناس نہیں تھے، بلکہ ایک بلند پایہ شاعر اور شگفتہ قلم ادیب بھی تھے۔ ان کے پرچے ماہ نامہ تجلی دیوبند کا ایک حصہ مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے دفاع کے لیے مختص ہوتا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب تجلی میں شائع ہونے والے اسی نوعیت کے مضامین کا انتخاب ہے۔ دلیل کی قوت اور ادب کی گرفت سے مرصع یہ جواب پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ علمائے کرام کس زبان میں اور کس انداز سے حملہ آور ہوتے تھے، مگر افسوس کہ وہ جان بوجھ کر اس حقیقت کو نظرانداز کر رہے تھے کہ وہ خود اپنے خلاف بھونڈے انداز سے گواہی دے رہے ہیں۔ ایسے مفتیان کرام سے عامر عثمانی مرحوم نے جو قلمی مباحثہ کیا، اس کی ایک جھلک جماعت اسلامی کا جائزہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (سلیم منصور خالد)

Indexation of Financial Assets — An Islamic Evaluation

[مالیاتی اثاثہ جات کی اشاریہ بندی: اسلامی نقطہ نظر سے ایک جائزہ]، ڈاکٹر ایس ایم حسن الزمان۔ ناشر: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، اسلام آباد۔ صفحات: ۲۸۰۔ قیمت: درج نہیں۔

یہ امر خوش آیند ہے کہ عہد حاضر میں اسلام کے معاشی نظام کی تفاصیل اور عصری تقاضوں کے تناظر میں پیدا ہونے والے معاشی مسائل، اسلامی معاشیات کے ماہرین کی خصوصی توجہ کا موضوع بن رہے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اہم اور نازک مسئلہ قرضوں اور امانتوں کی اشاریہ بندی (Indexation) ہے جسے بنیادی طور پر افراط زر (Inflation) کے عفریت نے جنم دیا ہے۔ افراط زر سے کسی ملک کی معیشت جن گھمبیر

مسائل سے دوچار ہو جاتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ زر کی قدر یا سکہ رائج الوقت کی قوت خرید کم ہوتی جاتی ہے اور یوں کسی قرض دار (creditor) نے مقروض کو جو رقم قرض دی ہوتی ہے، وہ بہ وقت واپسی، مقدار میں بے شک اتنی ہی ہو مگر اپنی اصل قدر یعنی قوت خرید کے اعتبار سے کم ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دَین (بہ معنی قرض) کے اس معاملے میں، مقروض کے مقابلے میں یہی قرض دار، سراسر نقصان میں رہتا ہے۔ ایک مکتب فکر کے مطابق انصاف کا تقاضا ہے کہ قرض دار کے اس نقصان کی تلافی کا اہتمام ہونا چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ افراط زر کی وجہ سے اشیا کی قیمتوں میں جس قدر اضافہ ہو (یا زر کی جتنی کم قدری ہوئی ہو) اس کے برابر رقم، قرض دار کو اس کی اصل رقم کے ساتھ مزید ادا کی جائے۔ زر کی اس کم قدری کا اندازہ متعلقہ مدت میں مختلف اشیا کی اوسط قیمتوں کے اشاریے (price index) سے لگایا جا سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر حسن الزمان نے، اس مسئلے پر اسلامی نقطہ نظر سے بڑے فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے گذشتہ پچاس سالوں میں اس مسئلے پر مختلف ممالک کے تجربات بھی بیان کیے ہیں اور شرعی نقطہ نظر سے اشاریہ بندی کی موافقت اور مخالفت میں پیش کیے جانے والے دلائل پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں اشاریہ بندی کی حمایت میں دیے جانے والے دلائل، محض نظری نوعیت کے ہیں جن کا علمی حقائق سے کوئی تعلق نہیں اور جو قرآن و سنت کے واضح احکامات اور فقہا کی مسلمہ آرا کی تائید سے محروم ہیں۔ ڈاکٹر حسن الزمان کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ شرعی اور اخلاقی اعتبار سے معاملات میں خسارے کی تلافی کا مکلف اسی شخص کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کے کسی قول و فعل سے خسارہ واقع ہوا ہو۔ زیر نظر بحث مسئلے میں زر کی کم قدری، جس افراط زر کی پیدا کردہ ہوتی ہے، مقروض کو کسی صورت بھی براہ راست اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ اس صورت میں خسارے کی تلافی کا تاوان اس پر ڈالنا سراسر ناانصافی ہے اور اسلام کسی درجے میں ناانصافی کو روا نہیں رکھتا۔

اشاریہ بندی کے حامی اپنے موقف کے حق میں سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۹ (نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے) سے بھی استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس آیہ مبارکہ کا پہلا حصہ [اگر تم (سود لینے سے) توبہ کر لو تو تم اپنے اصل سرمائے کے حق دار ہو]، ان کے اس موقف کی خود ہی تردید کر دیتا ہے کیونکہ اس میں قرض خواہ کے لیے اس کے راس المال کی وصولی ہی کو روا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے زائد وصولی اس کی طرف سے مقروض پر ظلم اور اس سے کم واپسی قرض خواہ پر ظلم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ راس المال یا تو زر کی کسی قابل پیمائش عددی شکل میں ہو گا یا کسی شے کی مقداری شکل میں۔ اسی عدد یا مقدار کی واپسی اور وصولی کا خداے علیم و خبیر نے اپنے کلام پاک میں حکم دیا ہے۔ اس عدد یا مقدار کی (مجہول) قوت خرید سے معاملے

کو مقید نہیں کیا۔

ڈاکٹر حسن الزمان کی رائے میں اسلام کے معاشی نظام کا مابہ الامتیاز وصف' عدل و قسط ہے۔ افراط زر' معیشت کو جس قسم کے ظلم اور ناانصافی سے دوچار کر دیتا ہے' اشاریہ بندی' اس کا علاج کرنے کے بجائے اسے مزید بڑھا دیتی ہے۔ ناانصافی کا تدارک افراط زر کو کنٹرول کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسلامی نظام معیشت میں اس عفریت پر قابو پانے کی بدرجہ اتم صلاحیت موجود ہے جبکہ عہد حاضر کے جملہ مادہ پرستانہ معاشی نظام' اسے بے لگام ہونے سے روکنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

طباعت کا معیار عمدہ ہے۔ تاہم چند مقامات پر پروف کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ ص ۴۲ پر سورۃ البقرہ کی آیت کا نمبر ۲۷۹ ہے نہ کہ ۲۸۱۔ ص ۸۹ پر Fried man کی کتاب کا نام' Can Inflation Cut Inflaction's Toll لکھا گیا ہے جبکہ ص ۸۷ اور ۸۸ پر Can Indexation Cut Inflation's Toll درج ہے۔ اس کی تصحیح کی ضرورت ہے۔ (عبدالحمید ڈار)

لمحوں کا قرض' زاہد منیر عامر۔ ناشر مطبوعات' ۵۹۶۔ نیلم بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور۔ صفحات: ۱۸۳۔ قیمت: ۱۱۰ روپے۔

آج کی نئی نسل' خصوصاً کالج اور یونی ورسٹیوں کی تعلیم سے' حال ہی میں فارغ ہونے والے طلبا و طالبات کو' زمینی حقائق کے ساتھ ساتھ گوناگوں ذہنی و جذباتی اور معاشی و معاشرتی مسائل کا سامنا ہے۔ تنہائی اور فارغ اوقات' داخلی جذبات' ذہنی اضطراب' گروہی وابستگیاں' دوستیوں کے دائرے' جذبہ عشق کی جہات' آرزوئیں اور تمنائیں' ظاہر پرستی کے تقاضے غرض گوناگوں' مختلف اور بسااوقات متضاد کیفیتوں کے نوجوان ایک کش مکش اور کشاکش کا شکار ہیں۔ زیر نظر کتاب کے نوجوان مصنف نے نوجوانوں کے ایسے ہی بنیادی مسائل پر بالغ نظری سے اور ایک کہنہ مشق ادیب کے اسلوب میں کلام کیا ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں اور اضطراب کو دور کرنے کے لیے نصیحت آموز باتیں ایسی عمدگی اور حکمت سے کی ہیں کہ ان سے قاری کو سوچ اور عمل کا ایک رابطہ ملتا ہے۔ زاہد منیر عامر کو موجودہ تعلیم کے تین نظاموں (دینی مدرسوں' ٹیکنیکل اداروں اور عمومی کالجوں) میں زیر تعلیم رہنے کا موقع ملا۔ اس وسیع مشاہدے اور تجربے نے مصنف پر بہت سی حقیقتیں منکشف کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: "میں نے اپنی طالب علمانہ زندگی کے مشاہدے اور تجربے کو اپنے اوپر ایک قرض محسوس کیا اور اس کتاب میں اسے ادا کرنے کی سعی کی ہے"۔

زاہد منیر کا انداز فکر مثبت' تعمیری اور دانش ورانہ ہے۔ اصل میں یہ کتاب نوجوان نسل سے ایک مکالمہ ہے جس کے معنی خیز مطالب کا مطالعہ کرتے ہوئے نوجوان قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ زندگی کسی نصب

الغین کے بغیر بے معنی ہے۔ مصنف نے نوجوانوں کو زندگی میں لا-حنیت کا خلا پر کرنے کا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ خوش گفتاری پر مشتمل یہ مجموعہ مضامین، نوجوان عزیزوں کو پیش کرنے کے لیے ایک مناسب تحفہ ہے۔ (د - ه)

An Introduction to Islamic Economics [اسلامی معاشیات: ایک تعارف]، محمد اکرم خان۔ ناشر: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، مرکز ایف/۷، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۵۸۔ قیمت: مجلد ۲۲۵، غیر مجلد ۱۷۵ روپے۔

بلاشبہ انسان کی شان امتیاز اس کا اشرف المخلوقات ہونا ہے مگر اس کی انسانیت میں اس وقت تک حقیقی شان پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اسے الٰہی ہدایت سے مربوط نہ کیا جائے۔ یہ ہدایت ایک مستحکم، عقلی، منصفانہ اور مصفیٰ نظام پر مشتمل ہے جس کی بنیاد قرآن اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ نے انسان کو دنیوی اور اخروی زندگی کے لیے عدل، ذمہ داری اور خدا ترسی کا درس دیا ہے۔ معیشت سے متعلق انسانی زندگی کا یہ اہم پہلو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔

زیر نظر کتاب میں جناب محمد اکرم خان نے ٹھوس اور پیشہ ورانہ انداز میں انسان کے معاشی مسئلے پر اسلامی رہنمائی کو پیش کیا ہے۔ سات ابواب پر مشتمل اس دستاویز میں اسلامی معاشیات کا جائزہ، اس کی نوعیت، اس کا طریق نفاذ، مستقبل کی تحدیات (challenges) کا ادراک اور اس کا جواب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جناب مصنف علم معاشیات میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس سے قبل انھوں نے اسلامی معاشیات پر قابل قدر تحقیقی مقالات تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں: "ہمیں پختہ یقین ہے کہ انسانیت کا مستقبل اسلام کے معاشی تصورات سے وابستہ ہے۔ انسان کے معاشی مسائل کے بارے میں اس کا نقطہ نظر بڑی انفرادی شان کا حامل ہے۔ اس حوالے سے گہرا اور سنجیدہ مطالعہ، ہم عصر معاشرے ہی کے لیے نہیں بلکہ مستقبل میں بھی انسانی کرب و الم کا شافی جواب دے سکتا ہے" (ص ۸۵-۸۶)۔

عصر حاضر میں اسلامی فکریات کو جس چیلنج کا سب سے بڑھ کر سامنا ہے، ان میں سے سرفہرست اسلامی معاشیات اور غیر سودی معیشت کی صورت گری اور نفاذ ہے۔ ہماری نئی نسل کے بہترین دماغوں کو اس میدان میں اترنا اور ایمان و فن کی پختگی کے ساتھ جواب دینے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو لگانا اور کھپانا چاہیے۔ یہ کتاب اہل فن کی ضروریات پورا کرتی ہے۔ ان افراد کے لیے جو انگریزی نہیں جانتے، اس کے اردو ترجمے کی ضرورت ہے۔ کتاب کا دیباچہ پروفیسر خورشید احمد نے تحریر کیا ہے۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی شامل ہے۔ (س - م - خ)

سنت نبویؐ اور جدید سائنس، حکیم محمد طارق محمود۔ ناشر: شعبہ تحقیق و تصنیف، دارالمطالعہ، بالمقابل جامع مسجد بازار والی، حاصل پور۔ صفحات: ۴۶۵۔ قیمت: ۱۷۵ روپے۔

طب نبویؐ طب میں ایک مکمل موضوع ہے جس پر اردو زبان میں بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ قرآن و حدیث کا اصل موضوع عوارض جسمانی نہیں، عوارض روحانی اور توحید کی طرف انسان کی راہنمائی ہے۔ جو مسائل، انسان اپنی تحقیق اور جستجو سے خاطر خواہ طریق سے حل کر سکتا ہے، قرآن ان میں عموماً دخل اندازی نہیں کرتا۔ اس کتاب میں چھیاسی موضوعات کے تحت مختلف عوارض کے سلسلے میں آنحضرتؐ کے طرز عمل کو پیش کیا گیا ہے۔ دور جدید کے ماہرین کی آرا کی روشنی میں، ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کا طریقہ (سنت) نہایت درست اور برمحل ہوتا تھا۔ مولف نے اپنے ہی مریضوں کی شفایابی کے واقعات، نیز بزرگوں کے واقعات اور دوستوں سے سنے ہوئے واقعات بھی کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب سنت نبویؐ، روز مرہ واقعات اور بزرگوں کے قصوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔

جدید سائنس سے علم کیمیا، طبیعیات، حیاتیات اور میڈیکل سائنس مراد لی جاتی ہے۔ مصنف نے آنحضرتؐ کے طرز عمل کی خوب وضاحت کی ہے، مثلاً مسواک سے لے کر قیلولہ اور آداب معاشرت تک کے لیے بہت سے راہنما اصول بیان کر دیے ہیں۔ بعض متعلقہ واقعات بھی درج کر دیے ہیں بلکہ جو واقعہ جہاں سے ملا، اسے شامل کتاب کر دیا ہے۔ کتاب کے موضوع کا تقاضا تھا کہ دور جدید میں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں، ان کو ماخذات کے ساتھ درج کیا جاتا اور اس کے بعد اسلامی احکامات کی بالادستی ثابت کی جاتی۔ اس طرح کتاب میں زیادہ وضاحت اور معنویت پیدا ہوتی۔

آغاز میں شامل، کتاب کے سترہ تقریظ نگاروں میں کوئی بھی سائنسی شخصیت نہیں ہے۔ ٹھوس، جامع، جان دار اور نتیجہ خیز تحریریں مزید محنت کی طالب ہوتی ہیں۔ طب نبویؐ جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل جدید سائنسی علوم سے کماحقہ واقفیت ضروری ہے کیونکہ مستشرقین نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس طرح کے موضوعات پر لکھنے والوں کو سنی سنائی باتوں کے بجائے صرف مستند ترین ماخذات ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ (محمد ایوب منیر)

دیار غزل، سید نظر زیدی۔ ناشر: صبح صادق پبلی کیشنز، لاہور۔ صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

سید نظر زیدی شاعروں اور ادیبوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اپنی صلاحیتوں سے اسلامی انقلاب کی علم بردار قوتوں کے پیغام کو عام کرنے کا کام لیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے زمانے میں

شاعری کا آغاز کیا جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ مگر اس تحریک کا مزاج اسلامی عقائد اور اخلاقی اقدار کے منافی تھا۔ اس لیے زیدی صاحب کو اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ انھوں نے اسلامی اقدار کی ترویج ہی کو اپنا مقصد قرار دیا۔ ان کی شاعری اسی ارفع مقصدیت کی ترجمان ہے۔ نظر زیدی نے غزل کو بھی ایک نئے رنگ سے آشنا کیا۔ وہ ضروریات فن سے بخوبی آگاہ ہیں، لہٰذا ان کے اشعار خاص تاثیر کے حامل ہیں اور ان میں تغیر و انقلاب کے امکانات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ نظر زیدی کی یہ خصوصیت ان کے مجموعہ کلام دیار غزل میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ آخر میں کچھ طنزیہ و مزاحیہ غزلیں بھی ہیں جو ۱۹۹۳ کے موقع پر کہی گئیں۔ یہ غزلیں اگر شامل کتاب نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

قاسم امین کی سماجی اور ادبی خدمات، سطوت ریحانہ۔ ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔ صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

قاسم امین (۱۸۶۳-۱۹۰۸) کو عالم عرب خصوصاً مصر کی جدید تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ وہ مشہور مصری عالم شیخ محمد عبدہ، کی تحریک سے متاثر اور ان کے رفقا میں شامل تھے۔ انھیں قانون، ادب اور اصلاح معاشرت سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے عالم عرب میں آزادی نسواں کی تحریک میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ مصر کی معاشرتی اور فکری تاریخ لکھنے والوں نے عام طور پر ان کی کوششوں کی تعریف کی ہے، تاہم ممتاز اہل علم نے اسلامی تعلیمات کے حوالے سے ان کے افکار پر تنقید بھی کی ہے۔ قاسم امین کی دعوت کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اندھی تقلید اور کہنہ رسم و رواج سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے پر زور دیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کے لیے حجاب کی پابندیوں کو توڑ دینے کی تلقین کی۔ قاسم امین نے شروع شروع میں اپنے خیالات کے اظہار میں قدرے احتیاط سے کام لیا لیکن بعدازاں انھوں نے مسلم معاشرے کو خامیوں کا مجموعہ بتاتے ہوئے، اسے شدت سے ہدف تنقید بنایا۔ ان کی دو کتابیں تحریر المراۃ اور المراۃ الجدیدہ ان کے موقف کی وضاحت کرتی ہیں۔ عورتوں کے بارے میں ان کی مخصوص فکر اور غیر محتاط رویے کی بنا پر ان پر شدید تنقید ہوئی۔

قاسم امین کے کام کی اصل قدر و قیمت پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت تھی بلکہ دوسرے شعبوں (خصوصاً عربی زبان و ادب) میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ناقدانہ جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ محترمہ سطوت ریحانہ کی زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایم فل کا ایک تحقیقی مقالہ ہے، جس میں مقالہ نگار نے معاصر مصر کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات، خصوصاً قاسم امین کی شخصیت کی تشکیل پر اثرانداز ہونے والے عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ مزید برآں قاسم امین کی سماجی خدمات اور عربی

زبان و ادب کے ضمن میں ان کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ حقوق نسواں کے سلسلے میں قاسم امین کے خیالات پر بحث خاصی متوازن ہے۔ کتاب میں حوالوں کا اہتمام ہے اور مآخذ و مراجع کی مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔ قیمت ضخامت کی نسبت زیادہ ہے۔ (د۔ ب۔ ش)

مجلہ **الایضاح**، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر معراج الاسلام ضیا۔ ناشر: شیخ زید اسلامک سنٹر، پشاور یونی ورسٹی۔ صفحات: ۱۸۶۔ قیمت: ۱۰۰ روپے / ۷ ڈالر۔

اس ششماہی عربی مجلے کے مضامین کی نوعیت زیادہ تر تحقیقی ہے۔ اصول تحقیق کے مطابق مضامین کے ساتھ حواشی اور حوالہ جات درج ہیں۔ مجلہ علم دوست احباب کے لیے مفید ہے، کیوں کہ یہ مفید معلومات فراہم کرنے کے علاوہ قارئین میں تحقیق و تخریج کا شوق بھی پیدا کرتا ہے۔ مضامین زیادہ تر حدیث، شریعت، تاریخ اسلام اور عربی زبان کے بارے میں ہیں۔ پروف خوانی ذرا بہتر انداز سے ہونی چاہیے۔ (نجیب الرحمٰن کیلانی)

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین مرحوم

ترجمان القرآن کے قلمی معاون اور تبصرہ نگار پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین ۱۸ جولائی ۱۹۹۸ کو راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شاہین مرحوم ایک بلند پایہ اسکالر اور عالمی شہرت یافتہ اقبال شناس تھے۔ اس وقت وہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اقبالیات کے فرائض انجام دے رہے تھے اور پیرس کی ایک یونی ورسٹی میں اقبال سٹڈیز چیر پر ان کا انتخاب ان دنوں زیر غور تھا۔ قبل ازیں کئی سال تک وہ مختلف کالجوں میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ایک عرصے تک وہ تنظیم اساتذہ پاکستان کے بانی صدر ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کے دست راست کے طور پر، تنظیم سے منسلک رہے۔ اقبالیات پر وہ متعدد وقیع کتابوں کے مولف تھے (اوراق گم گشتہ، ارمغان اقبال، اقبال کے معاشی نظریات اور Mementos of Iqbal) انھوں نے مولانا مودودیؒ کے انٹرویو بھی جمع و مرتب کر کے دو جلدوں میں شائع کیے تھے۔

مرحوم کی وفات سے ادارہ، ایک فاضل قلمی معاون سے محروم ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین! (ادارہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

جس بستی میں تین افراد موجود ہوں وہ جماعت کا اہتمام نہ کرتے ہوں تو ان پر شیطان غالب آ جاتا ہے۔ اس لیے تم نماز کے لیے جماعت کی پابندی اپنے اوپر لازم رکھو کیونکہ بھیڑیا ان بھیڑوں کو کھا جاتا ہے جو اپنے ریوڑ سے دور رہتی ہیں۔ (ابوداؤد)

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵- اے ذیلدار پارک' اچھرہ لاہور سے شائع کیا

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے۔



ٹھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جو زرِ منافع ...
شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں ... کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-HRA-8/97

C.P.L. 236

Phone : 7587976
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.

برائے ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰، فون نمبر ۸-۷۵۷۰۱۲۴ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰، فون نمبر ۷۲۳۴۰۱۴-۷۲۳۶۶۶۵، پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۱۰ روپے ○ زر سالانہ: ۱۰۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۵۰۰ روپے، یورپ: ۶۰۰ روپے، امریکہ و آسٹریلیا: ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر دفتر، ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

ادارۂ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)